صفر المظفر 1433ھ

جنوری 2012ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

خصوصی مضمون

پاکستان کے موجودہ مسائل اور اُن کا حل

قرآن و سنت کی روشنی میں

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید

مرکزی شعبہ نشر و اشاعت
کی پیشکش

CALENDAR 2012

6 صفحات پر مشتمل شمسی و قمری کیلنڈر
قرآنی آیات کی خوبصورت خطاطی سے مزیّن

☆ 4 دیدہ زیب رنگ ☆ خوبصورت ڈیزائن
☆ عمدہ آرٹ پیپر ☆ سائز "18"x23

خصوصی رعایتی قیمت 60 روپے

رفقاء و احباب یہ خوبصورت کیلنڈر خود بھی لیں
اور دعوتی نقطہ نظر سے خرید کر احباب میں تحفہ کے طور پر تقسیم کریں
رفقاء تنظیم اسلامی کیلنڈر حاصل کرنے کے لیے اپنے مقامی مراکز کے ذریعے رابطہ کریں

مرکزی شعبہ نشر و اشاعت تنظیم اسلامی
K-36، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: 3-35869501(042)
فیکس: 35834000
media@tanzeem.org

مرکز تنظیم اسلامی
67۔اے علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور
فون: 36316638,36366638
فیکس: 36271241
markaz@tanzeem.org

www.tanzeem.org

مشمولات

عرضِ احوال ——— 3
انسان اور جنگ
ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن ——— 6
سورۃ الاعراف (آیات ۱۵۸تا۱۷۸)
ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ ——— 27
پاکستان کے موجودہ مسائل اور ان کا حل
قرآن و سنت کی روشنی میں
حافظ عاکف سعید

اعتصامش کن ——— 56
وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ
حافظہ منزہ رشید

تزکیہ و تربیت ——— 65
تربیت اولاد میں حیا کا عنصر
نگہت حسین

حسن معاشرت ——— 76
امن و سلامتی کا پیام بر کلمہ
عتیق الرحمٰن صدیقی

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ ——— 83
اذان اور اقامت
حافظ محمد زاہد

* * *

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 61
شمارہ : 1
صفر المظفر 1433ھ
جنوری 2012ء
فی شمارہ 25/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید
نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرَّحِیم

انسان اور جنگ

روئے ارضی پر جتنے بھی چرند اور پرند ہیں انہیں جان کے تحفّظ اور جنسی خواہش کی تکمیل کے سوا کسی چیز کی فکر نہیں ہوتی۔ اپنی بھوک کو مٹانا اور موسم کی شدت وغیرہ سے خود کو محفوظ رکھنا بھی جان کے تحفّظ کے ذیل میں آتا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ ہر سطح پر امکانی جدّوجہد کرتے ہیں' یہاں تک کہ لڑائی جھگڑا کرنے اور جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ابتدائے آفرینش میں انسان کی جِدّوجُہد بھی ان دو مقاصد تک محدود تھی' یعنی اپنی جان کا تحفّظ اور جنسی خواہش کی تکمیل۔ پہلا انسانی قتل بھی اسی حوالہ سے ہوا جب قابیل نے ہابیل کو شادی کے مسئلہ پر قتل کر دیا۔ بعد ازاں انسانوں اور دوسرے جانداروں میں یہ فرق سامنے آیا کہ انسان کی خواہشات' ضروریات اور مفادات کا دائرہ وقت گزرنے کے ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ مفادات اور ضروریات میں اضافہ ہوا تو اس کے لیے جدوجہد' لڑائی جھگڑا اور جنگوں میں بھی اضافہ ہوا۔

انسانوں میں اجتماعی زندگی کا آغاز ہوا' قبیلے وجود میں آئے' ملک اور ریاستیں بنیں تو جنگ و جدل بھی اجتماعی اور ریاستی سطح پر شروع ہو گیا۔ اب جنگ وسائل کی لوٹ مار اور اقتدار کے حصول کے لیے ہونے لگی۔ مذہب بھی جنگ کی وجہ بنا۔ بہرحال شروع میں یہ جنگیں جسمانی قوت اور تیر و تفنگ سے لڑی جاتی تھیں۔ غلبہ اور اقتدار کی خواہش نے انسان کے ہاتھوں نئے نئے ہتھیار ایجاد کروائے' پھر وہ وقت بھی آیا کہ صنعتی انقلاب نے ان جنگوں کو اور ہی شکل دے دی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ اب جنگ مشینوں کے درمیان ہوتی ہے۔ آسمان سے بارود کی بارش انسانی بستیوں کا نام ونشان مٹا دیتی ہے۔ ایک جگہ بیٹھا کوئی شخص بٹن دباتا ہے تو ہزاروں میل دور تباہی اور بربادی کے ناقابل بیان منظر دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ایک بات طے شدہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر پوری دنیا کو ملیامیٹ تو کیا جا سکتا ہے' البتہ زندہ لوگوں اور ملکوں پر قبضہ جمانے اور انہیں زیر کرنے کے لیے آج بھی انسان درکار ہیں' اور نہ صرف انسان ہونا بلکہ ان کا بہادر ہونا اور شجاعت کے کارنامے دکھانا بھی اشد ضروری ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر تک شاید اس بات کو ثابت کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت تھی' لیکن اکیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں طالبانِ افغانستان نے ایک ایسی زندہ مثال پیش کی کہ کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہی۔ آج دوست دشمن سب تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ امریکہ جو آج بھی چاہے تو اس پوری دنیا کو کئی مرتبہ تباہ و برباد کر سکتا ہے' سارے افغانستان کو نہیں صرف طالبان افغانستان کو جن کی تعداد چند ہزار نفوس سے زائد نہیں' جو بے سروسامان ہیں اور انیسویں صدی کا اسلحہ رکھتے ہیں' زیرِ تسلّط لانے اور سرزمین افغانستان پر قبضہ کرنے کے حوالہ سے بے بس اور لاچار نظر آتا ہے۔ بہرحال ہم بتانا صرف یہ چاہتے تھے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی بھی یہاں پہنچ کر ناکام ہو جاتی ہے۔ انسانوں کی بہادری' اپنے مشن سے وابستگی' اپنے نظریہ پر غیر متزلزل ایمان' اس حوالہ سے اب بھی فیصلہ کن رول ادا کرتے ہیں۔

سائنسی ترقی اور تہذیبی وتمدّنی ارتقاء نے جنگ کو ایک اور سمت بھی دی ہے۔ اسلحی اور بارودی جنگ سے پہلے ذہنی اور فکری سطح پر تبلیغی جنگ لڑی جاتی ہے' جسے جدید اصطلاح میں میڈیا وار کہتے ہیں' اور یہ جنگ اتنی شدّت اور زوردار انداز میں لڑی جاتی ہے کہ بعض اوقات اسلحہ اور بارود سے جنگ کرنے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ اس لیے کہ میڈیا وار میں نااہلی اور کمزوری دکھانے والا فریق اس قدر مایوس ہو جاتا ہے اور اس کے حوصلے اتنے پست ہو جاتے ہیں کہ وہ بغیر جنگ کیے پسپائی اختیار کر لیتا ہے۔ امریکہ بھی افغانستان پر حملہ آور ہونے سے پہلے پاکستان پر میڈیا کے ذریعہ حملہ آور ہوا۔ فوجی آمر پرویز مشرف اتنا خوف زدہ ہوا کہ فوری طور پر میدان چھوڑ گیا بلکہ مسلمانوں کے دشمن کی فوج سے جا ملا۔ آج پرویز مشرف ذلیل وخوار ہو کر دیارِ غیر میں پناہ لے چکا ہے' لیکن بدقسمتی سے مشرفی سوچ آج بھی میڈیا وار کے ذریعے پاکستانیوں کے حوصلے پست کر رہی ہے' بلکہ صحیح تر الفاظ میں اب پاکستانی میڈیا پر اسلام کے نام لیواؤں اور سیکولرازم کے گماشتوں کے درمیان میڈیا وار کا رخ اختیار کر گئی ہے' اگرچہ بحیثیت مجموعی سیکولر عناصر میڈیا پر چھائے ہوئے ہیں اور انہیں اپنے بیرونی آقاؤں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ اسلام کے حوالے سے بات کرنے والے قلیل بھی ہیں اور وسائل کے لحاظ سے غریب بھی' لہٰذا انہیں مواقع بھی کم میسّر آتے ہیں۔ پھر یہ کہ میڈیا کے سنٹرز تک ان کی رسائی ہو بھی جائے تو یہ عناصر ان کی آواز دبانے کی ہر سطح پر کوشش کرتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ الحمدللہ وطن عزیز میں اگرچہ اسلامی ذہن' سوچ اور فکر رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے لیکن وہ میڈیا وار کے حوالہ سے متّحد اور متّفق نہیں۔ بعض حضرات اسلام کے حوالہ سے مخلص ہونے کے باوجود ذاتی اور اجتماعی طور پر میڈیا کی اہمیت کو سمجھ نہیں پائے۔ ہم سمجھتے ہیں اس جنگ میں سنجیدگی سے پروقار انداز میں اور اسلام کے بنیادی احکامات کی پابندی کرتے ہوئے حصہ لینا چاہیے' وگرنہ سیکولر عناصر عوام کی عظیم اکثریت کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ علاوہ

ازیں ان نام نہاد ماڈرن اسلامک سکالروں کا راستہ بھی روکا جا سکے گا جو اسلام کو مغرب کے لیے قابلِ قبول بنانے کے لیے ان قرآنی محکمات کی بھی مَن گھڑت تاویلیں کر کے جو اسلاف سے بلکہ قرونِ اولیٰ سے آج تک کبھی متنازعہ نہ ہوئے تھے (مثلاً پردہ، جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ) ان کے بارے میں بھی سادہ لوح مسلمانوں کے اذہان میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں۔ اس میڈیا وار میں حصہ لے کر کفر اور منافقت کا بھرپور مقابلہ کیا جانا چاہیے۔

ہم نے بات کا آغاز کیا تھا جان کے تحفظ اور اپنی نسل کی بڑھوتری کے لیے جدّوجہد اور جنگ کرنے سے۔ پھر جب مذہب جنگوں کی بنیاد بنا تو قریباً تمام مذاہب نے ان جنگوں کے تقدس کا اعلان کیا۔ اسلام اس حوالہ سے بھی سرفہرست رہا۔ قرآن نے انتہائی زوردار انداز میں جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی بات کی، بلکہ وہ وقت بھی آیا کہ مسلمانوں کو قتال فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا۔ گویا جنگ صرف اپنے جسمانی اور نفسانی تقاضوں کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ روحانی سطح پر بلند ترین مقام حاصل کرنے کے لیے حالات اور واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے لازم قرار پائی۔ انسانوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے اور ان کی دنیوی اور اخروی فلاح کے لیے نبی اکرم ﷺ جیسی رحیم اور شفیق شخصیت کو بھی میدانِ جنگ میں اترنا پڑا۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ”جو شخص اس حالت میں مرا کہ نہ تو وہ کسی جنگ میں شریک ہوا اور نہ ہی اس کے دل میں جہاد و قتال کی خواہش ہی پیدا ہوئی، وہ ایک طرح سے منافقت کی موت مرا“۔ یہ حدیث مبارک آج کے مسلمانوں کی بہت خوب رہنمائی کرتی ہے۔ اس لیے کہ آج کے ٹیکنالوجی کے دور میں جنگ یعنی قتال میں حصہ لینا عام مسلمان کے بس کی بات نہیں ہے، لہٰذا ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جس سطح پر بھی اور جس انداز میں بھی کفار کا مقابلہ کر سکتا ہے کرے اور بعض ماڈرن سکالر جو اسلام کو اغوا کرنا چاہتے ہیں، ان کے راستے کی رکاوٹ بنے۔ اس لیے کہ جنگ جان کے تحفّظ کے لیے ہی نہیں روح کو زندہ رکھنے اور آخرت میں فلاح حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں دشمن آپ پر جنگ مسلّط کر رہا ہے، کر چکا ہے۔ یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ نے جنگ میں کس انداز سے حصہ لینا ہے۔ اپنے حالات، اپنے ماحول اور اپنے جغرافیہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے آپ دینِ متین کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں۔ بارود کی بارش میں اور توپوں کے گولوں کے چھاؤں میں میدانِ جنگ میں اترا جائے، یا پہلے ایک خطہ زمین میں اسلام اپنی صحیح ترین شکل میں نافذ کرنے کے لیے ایک ترتیب سے جہاد کیا جائے، یا علم کی روشنی پھیلا کر جہالتِ قدیمہ اور جدیدہ کے خلاف جہاد کیا جائے وغیرہ۔ بہرحال جسم و جان کی حفاظت کے لیے، روح کو زندہ رکھنے کے لیے جنگ کرنا ہوگی، جنگ کرنا ہوگی! ۞۞

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الاعْراف

آیات ۱۵۸ تا ۱۶۲

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا ۣ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ
الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ وَاتَّبِعُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ۝۱۵۸ وَمِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤی
اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ۝۱۵۹ وَقَطَّعۡنٰہُمُ اثۡنَتَیۡ عَشۡرَۃَ اَسۡبَاطًا
اُمَمًا ؕ وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اِذِ اسۡتَسۡقٰىہُ قَوۡمُہٗۤ اَنِ اضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ
الۡحَجَرَ ۚ فَانۡۢبَجَسَتۡ مِنۡہُ اثۡنَتَا عَشۡرَۃَ عَیۡنًا ؕ قَدۡ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَہُمۡ ؕ
وَظَلَّلۡنَا عَلَیۡہِمُ الۡغَمَامَ وَاَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہِمُ الۡمَنَّ وَالسَّلۡوٰی ؕ کُلُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ
مَا رَزَقۡنٰکُمۡ ؕ وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ۝۱۶۰ وَاِذۡ قِیۡلَ لَہُمُ
اسۡکُنُوۡا ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃَ وَکُلُوۡا مِنۡہَا حَیۡثُ شِئۡتُمۡ وَقُوۡلُوۡا حِطَّۃٌ وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ
سُجَّدًا نَّغۡفِرۡ لَکُمۡ خَطِیۡٓـٰٔتِکُمۡ ؕ سَنَزِیۡدُ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝۱۶۱ فَبَدَّلَ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا
مِنۡہُمۡ قَوۡلًا غَیۡرَ الَّذِیۡ قِیۡلَ لَہُمۡ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
کَانُوۡا یَظۡلِمُوۡنَ ۝۱۶۲

اب اگلی آیت کا مطالعہ کرنے سے پہلے دو باتیں اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ایک تو گزشتہ آیات کے مضمون کا اس آیت کے ساتھ ربط کا معاملہ ہے۔ اس ربط کو یوں سمجھنا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے بعد انباء الرسل کے اس سلسلے کو نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت تک لانے میں بہت تفصیل درکار تھی۔ اس تفصیل کو چھوڑ کر اب براہِ راست آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ لوگوں کو بتا دیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں تمام بنی نوع انسان کی طرف۔ چنانچہ پچھلی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر اور تورات و انجیل میں نبی آخر الزماں کے بارے میں بشارتوں کے حوالے سے اس آیت کا سیاق و سباق گویا یوں ہو گا کہ اے محمد ﷺ اب آپ علی الاعلان کہہ دیجیے کہ میں ہی وہ رسول ہوں جس کا ذکر تھا تورات اور انجیل میں‘ مجھ پر ہی ایمان لانے کی تاکید ہوئی تھی موسیٰؑ کے پیروکاروں کو‘ میری ہی دعوت پر لبیک کہنے والوں کے لیے وعدہ ہے اللہ کی خصوصی رحمت کا‘ اور اب میری ہی نصرت اور اطاعت کا حق ادا کرنے والوں کو ضمانت ملے گی ابدی واخروی فلاح کی!

دوسری اہم بات یہاں یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ اس سورۃ میں ہم نے اب تک جتنے رسولوں کا تذکرہ پڑھا ہے‘ ان کا خطاب ’’یَا قَوۡمِ‘‘ (اے میری قوم کے لوگو!) کے الفاظ سے شروع ہوتا تھا‘ مگر محمد عربی ﷺ کی یہ امتیازی شان ہے کہ آپؐ کسی مخصوص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے بلکہ آپؐ کی رسالت آفاقی اور عالمی سطح کی رسالت ہے اور آپؐ پوری بنی نوعِ انسانی کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱ میں ’’عبادتِ رب‘‘ کا حکم جس آفاقی انداز میں دیا گیا ہے اس میں بھی اسی حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾۔ اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم اس آیت کا مطالعہ کرتے ہیں:

آیت ۱۵۸ ﴿قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف‘‘

یہ بات مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں قرآن حکیم کے پانچ مقامات پر دہرائی گئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ ان میں سورۃ سبا کی آیت ۲۸ سب سے نمایاں ہے: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ ’’ہم نے نہیں بھیجا ہے (اے محمد ﷺ) آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر۔‘‘

﴿الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۪﴾ ’’(اُس اللہ کا) جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے‘ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ وہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت وارد کرتا ہے۔‘‘

﴿فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ وَاتَّبِعُوۡہُ

﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵۸﴾ ’’تو ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر جو نبی اُمّی ہے‘ جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اُس کے سب کلاموں پر‘ اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔‘‘

یہ گویا اعلانِ عام ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کہ میری بعثت اُس وعدے کے مطابق ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے بعد کی یہ آیات گویا اس خطاب کی تمہید ہے جو یہودِ مدینہ سے ہونے والا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ سورت ہجرت سے قبل نازل ہوئی تھی اور اس کے نزول کے فوراً بعد ہجرت کا حکم آنے کو تھا‘ جس کے بعد دعوت کے سلسلے میں حضور ﷺ کا مدینہ کے یہودی قبائل سے براہِ راست سابقہ پیش آنے والا تھا۔ مکی قرآن میں ابھی تک یہود سے براہِ راست خطاب نہیں ہوا تھا‘ ابھی تک یا تو اہلِ مکہ مخاطب تھے یا حضور ﷺ یا پھر آپ ﷺ کی وساطت سے اہلِ ایمان۔ لیکن اب اندازِ بیان میں جو تبدیلی آ رہی ہے اس کا اصل محل ہجرت کے بعد کا ماحول تھا۔

آیت ۱۵۹ ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝۱۵۹﴾ ’’اور موسیٰؑ کی قوم میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی تھی جو حق کی ہدایت دیتے تھے اور حق ہی کے ساتھ عدل و انصاف بھی کرتے تھے۔‘‘

اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل تھی مگر آپؑ کے پیروکاروں میں حق پرست اور انصاف پسند افراد بھی موجود تھے جو لوگوں کو حق بات کی تلقین کرتے تھے اور ان کے فیصلے بھی عدل و انصاف پر مبنی ہوتے تھے۔

آیت ۱۶۰ ﴿وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ﴾ ’’اور ہم نے ان کو علیحدہ علیحدہ کر دیا بارہ قبیلوں کی جماعتوں میں۔‘‘

ان کی نسل حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں سے چلی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لحاظ سے ان میں ایک مضبوط قبائلی نظام کو قائم رکھا۔ ہر بیٹے کی اولاد سے ایک قبیلہ وجود میں آیا اور یہ الگ الگ بارہ جماعتیں بن گئیں۔

﴿وَاَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ﴾ ’’اور ہم نے وحی کی موسیٰؑ کی طرف‘ جب پانی طلب کیا آپؑ سے آپؑ کی قوم نے‘ کہ اپنی لاٹھی سے چٹان پر ضرب لگائیے۔‘‘

﴿فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ﴾ ’’پس اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے‘ تو ہر قبیلے نے جان لیا اپنے اپنے گھاٹ کو۔‘‘

مَشرب اسمِ ظرف ہے‘ یعنی پانی پینے کی جگہ۔ ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ معین کر لیا تا کہ پانی کی تقسیم میں کسی قسم کا کوئی تنازعہ جنم نہ لے۔

﴿وَظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ﴾ ’’اور ہم نے ان کے اوپر بادل کا سائبان بنائے رکھا‘ اور اتارا ہم نے ان پر مَنّ اور سلویٰ۔‘‘

﴿كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ﴾ ’’(اور ان سے کہا کہ) کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں رزق میں دی ہیں۔‘‘

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝۱۶۰﴾ ’’اور انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا‘ بلکہ وہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔‘‘

وہ اللہ کا کچھ نقصان کر بھی کیسے سکتے تھے۔ اللہ کا کیا بگاڑ سکتے تھے؟ ایک حدیث قدسی کا مفہوم اس طرح سے ہے:

> ’’اے میرے بندو‘ اگر تمہارے اوّلین بھی اور آخرین بھی‘ انسان بھی اور جن بھی‘ سب کے سب اتنے متقی ہو جائیں جتنا کہ تم میں کوئی بڑے سے بڑا متقی ہو سکتا ہے‘ تب بھی میری سلطنت اور میرے کارخانۂ قدرت میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا —— اور اگر تمہارے اوّلین و آخرین اور انس و جن سب کے سب ایسے ہو جائیں جتنا کہ تم میں کوئی زیادہ سے زیادہ سرکش و نافرمان ہو سکتا ہے‘ تب بھی میری سلطنت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔‘‘(۱)

آیت ۱۶۱ ﴿وَاِذْ قِیْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ﴾ ’’اور یاد کرو جب ان سے کہا گیا تھا کہ آباد ہو جاؤ اس بستی میں اور اس میں سے کھاؤ (پیو) جہاں سے بھی چاہو‘‘

اس شہر کا نام ’’اریحا‘‘ تھا‘ جو آج بھی جریکو (Jericho) کے نام سے موجود ہے۔ یہ فلسطین کا پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون کی

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب تحریم الظلم۔ راوی: ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ۔

سرکردگی میں باقاعدہ جنگ کر کے فتح کیا تھا۔

﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ ''اور استغفار کرتے رہو' اور شہر کے دروازے میں سر جھکا کر داخل ہونا''

انہیں حکم دیا گیا تھا کہ جب شہر میں داخل ہوں تو 'حِطَّةٌ' کا وِرد کرتے ہوئے داخل ہوں۔ اس لفظ کے معنی استغفار کرنے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنی لغزشوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگتے ہوئے شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں دوسرا حکم یہ تھا کہ جب تم فاتح کی حیثیت سے شہر کے دروازے سے داخل ہو تو اُس وقت اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی اختیار کرتے ہوئے سجدۂ شکر ادا کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس وقت تکبر سے تمہاری گردنیں اکڑی ہوئی ہوں۔

﴿نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝١٦١﴾ ''ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے' اور ہم محسنین کو اور بھی زیادہ عطا کریں گے۔''

اس طرح سے ہم نہ صرف یہ کہ تمہاری خطائیں لغزشیں اور فروگزاشتیں معاف کر دیں گے' بلکہ تم میں سے مخلص اور نیک لوگوں کو مزید نوازیں گے' ان کے درجات بلند کریں گے اور ان کو اونچے اونچے مراتب عطا کریں گے۔

آیت ۱۶۲ ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ ''تو بدل دی ان لوگوں نے جو ان میں سے ظالم تھے اس بات کے بجائے جو ان سے کہی گئی تھی ایک (دوسری) بات''

یعنی ان کو 'حِطَّةٌ' 'حِطَّةٌ' کا ورد کرتے ہوئے شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا' جبکہ انہوں نے اس کے بجائے 'حِنْطَةٌ' 'حِنْطَةٌ' کہنا شروع کر دیا' جس کا مطلب تھا کہ ہمیں گیہوں چاہیے' ہمیں گیہوں چاہیے!

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝١٦٢﴾ ''تو ہم نے بھیج دیا ان پر ایک عذاب آسمان سے بسبب اس ظلم کے جو وہ اپنے اوپر کرتے تھے۔''

جن لوگوں نے وہ لفظ بدلنے کی حرکت کی تھی ان میں طاعون کی بیماری پھوٹ پڑی اور وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

آیات ۱۶۳ تا ۱۷۱

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ
اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ
كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝١٦٣ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ
قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى
رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝١٦٤ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ
عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَـِٔيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝١٦٥
فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝١٦٦ وَاِذْ تَاَذَّنَ
رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ
رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١٦٧ وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ
اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ
وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝١٦٨ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ
يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ
عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا
عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝١٦٩ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا
نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝١٧٠ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ
وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝١٧١

آیت ۱۶۳ ﴿وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ﴾ ''اور ان سے ذرا پوچھئے اس بستی کے بارے میں جو ساحل سمندر پر تھی۔''

اب یہ اصحابِ سبت کا واقعہ آ رہا ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ بستی اس مقام پر واقع تھی جہاں آج کل ''ایلات'' کی بندرگاہ ہے۔ ۱۹۶۶ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر نے اسی بندرگاہ کا گھیراؤ کیا تھا' جس کے خلاف اسرائیل نے شدید ردِّعمل کا اظہار کرتے ہوئے مصر' شام اور اردن پر حملہ کر کے ان کے وسیع علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مصر سے جزیرہ نمائے سینا' شام سے جولان کی پہاڑیاں اور اردن سے پورا مغربی کنارہ' جو فلسطین کا زرخیز ترین علاقہ ہے' ہتھیا لیا تھا۔ بہرحال ایلات کی اس بندرگاہ کے علاقے میں مچھیروں کی وہ بستی آباد تھی جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔

﴿اِذۡ یَعۡدُوۡنَ فِی السَّبۡتِ﴾ ''جب کہ وہ سبت کے قانون میں حد سے تجاوز کرنے لگے''

﴿اِذۡ تَاۡتِیۡہِمۡ حِیۡتَانُہُمۡ یَوۡمَ سَبۡتِہِمۡ شُرَّعًا﴾ ''جب کہ آتی تھیں اُن کی مچھلیاں اُن کے پاس ہفتے کے دن چھلانگیں لگاتی ہوئی''

شُرَّع کے معنی ہیں سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اس سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ کسی جگہ مچھلیوں کی بہتات ہو اور وہ بے خوف ہو کر بہت زیادہ تعداد میں پانی کی سطح پر ابھرتی ہیں' چھلانگیں لگاتیں ہیں۔ اس طرح کے منظر کو یہاں شُرَّعًا سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ یعنی مچھلیوں کی اس بے خوف اچھل کود کا منظر ایسے تھا جیسے کہ نیزے چل رہے ہوں۔ دراصل تمام حیوانات کو اللہ تعالیٰ نے چھٹی حِس سے نواز رکھا ہے۔ ان مچھلیوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہفتے کے دن خاص طور پر ہمیں کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ اس لیے اس دن وہ بے خوف ہو کر ہجوم کی صورت میں اٹھکیلیاں کرتی تھیں' جبکہ وہ لوگ جن کا پیشہ ہی مچھلیاں پکڑنا تھا وہ ان مچھلیوں کو بے بسی سے دیکھتے تھے' ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے' کیونکہ یہود کی شریعت کے مطابق ہفتے کے دن ان کے لیے کاروبارِ دُنیوی کی ممانعت تھی۔

﴿وَّیَوۡمَ لَا یَسۡبِتُوۡنَ ۙ لَا تَاۡتِیۡہِمۡ ۚ﴾ ''اور جس دن سبت نہیں ہوتا تھا وہ ان کے قریب نہیں آتی تھیں''

ہفتے کے باقی چھ دن مچھلیاں ساحل سے دور گہرے پانی میں رہتی تھیں' جہاں سے وہ انہیں پکڑ نہیں سکتے تھے' کیونکہ اس زمانے میں ابھی ایسے جہاز اور آلات وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے کہ وہ لوگ گہرے پانی میں جا کر مچھلی کا شکار کر سکتے۔

﴿کَذٰلِکَ ۚ نَبۡلُوۡہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ (۱۶۳)﴾ ''اس طرح ہم انہیں آزماتے تھے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔''

آئے دن کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو اس آزمائش میں ڈالا گیا کہ شریعت کے حکم پر قائم رہتے ہوئے فاقے برداشت کرتے ہیں یا پھر نافرمانی کرتے ہوئے شریعت کے ساتھ تمسخر کی صورت نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور ان میں سے کچھ لوگوں نے اس قانون میں چور دروازہ نکال لیا۔ وہ ہفتے کے روز ساحل پر جا کر گڑھے کھودتے اور نالیوں کے ذریعے سے انہیں سمندر سے ملا دیتے۔ اب وہ سمندر کا پانی ان گڑھوں میں لے کر آتے تو پانی کے ساتھ مچھلیاں گڑھوں میں آ جاتیں اور پھر وہ ان کی واپسی کا راستہ بند کر دیتے۔ اگلے روز اتوار کو جا کر ان مچھلیوں کو آسانی سے پکڑ لیتے اور کہتے کہ ہم ہفتے کے روز تو مچھلیوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس طرح شریعت کے حکم کے ساتھ انہوں نے یہ مذاق کیا کہ اس حکم کی اصل روح کو مسخ کر دیا۔ حکم کی اصل روح تو یہ تھی کہ چھ دن دنیا کے کام کرو اور ساتواں دن اللہ کی عبادت کے لیے وقف رکھو' جبکہ انہوں نے یہ دن بھی گڑھے کھودنے' پانی کھولنے اور بند کرنے میں صرف کرنا شروع کر دیا۔

اب اس آبادی کے لوگ اس معاملے میں تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ تو براہِ راست اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھا۔ جب کہ دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جو اس گناہ میں ملوث تو نہیں تھے مگر گناہ کرنے والوں کو منع بھی نہیں کرتے تھے' بلکہ اس معاملے میں یہ لوگ خاموش اور غیر جانبدار رہے۔ تیسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو گناہ سے بچے بھی رہے اور پہلے گروہ کے لوگوں کو ان حرکتوں سے منع کر کے باقاعدہ نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے۔ اب اگلی آیت میں دوسرے اور تیسرے گروہ کے افراد کے درمیان مکالمہ نقل ہوا ہے۔ غیر جانبدار رہنے والے لوگ نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والے لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ اللہ کے نافرمان لوگ تو تباہی سے دوچار ہونے والے ہیں' انہیں سمجھانے اور نصیحتیں کرنے کا کیا فائدہ؟

آیت ۱۶۴ ﴿وَاِذۡ قَالَتۡ اُمَّۃٌ مِّنۡہُمۡ لِمَ تَعِظُوۡنَ قَوۡمَا ۙ اللّٰہُ مُہۡلِکُہُمۡ اَوۡ مُعَذِّبُہُمۡ عَذَابًا شَدِیۡدًا ؕ﴾ ''اور جب کہا ایک گروہ نے ان میں سے کہ کیوں نصیحت کر رہے ہو ان لوگوں کو جنہیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا پھر انہیں عذاب دینے والا ہے بہت

سخت عذاب۔"

دوسرے گروہ کے لوگ تیسرے گروہ کے لوگوں سے کہتے کہ تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو ان مجرموں کے لیے ہلکان کر رہے ہو۔ اب یہ لوگ ماننے والے نہیں۔ اللہ کا عذاب اور تباہی ان کا مقدر بن چکی ہے۔

﴿قَالُوۡا مَعۡذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمۡ﴾ "انہوں نے کہا کہ تمہارے رب کے ہاں معذرت پیش کرنے کے لیے"

تیسرے گروہ کے لوگ جواب دیتے کہ اس طرح ہم اللہ کے سامنے عذر پیش کر سکیں گے کہ اے پروردگار! ہم آخری وقت تک نافرمان لوگوں کو ان کی غلط حرکتوں سے باز رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے' نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتے رہے۔ ہم نہ صرف خود اس گناہ سے بچے رہے بلکہ ان ظالموں کو خبردار بھی کرتے رہے کہ وہ اللہ کے قانون کے سلسلے میں حد سے تجاوز نہ کریں۔

﴿وَلَعَلَّہُمۡ یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ "اور شاید کہ وہ تقویٰ اختیار کر ہی لیں۔"

پھر اس بات کا امکان بھی بہرحال موجود ہے کہ ہماری نصیحت ان پر اثر کرے اور اس طرح سمجھانے بجھانے سے کسی نہ کسی کے دل کے اندر خدا خوفی کا جذبہ پیدا ہو ہی جائے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

((لَاَنۡ یَّھۡدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا وَاحِدًا خَیۡرٌ لَکَ مِنۡ اَنۡ یَّکُوۡنَ لَکَ حُمۡرُ النَّعَمِ))(۱)

" (اے علیؓ) اگر اللہ تمہارے ذریعے سے ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ دولت تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے۔"

آیت ۱۶۵ ﴿فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُکِّرُوۡا بِہٖۤ اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ﴾ "پھر جب انہوں نے نظر انداز کر دیا اس نصیحت کو جو انہیں کی جا رہی تھی' تو ہم نے بچا لیا ان کو جو برائی سے روکتے تھے"

﴿وَاَخَذۡنَا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍۭ بَئِیۡسٍۭ بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۵﴾﴾ "اور پکڑ لیا ہم نے ان کو جو ظلم کے مرتکب ہوئے تھے بہت ہی برے عذاب میں' ان کی نافرمانی کے سبب۔"

آیت ۱۶۶ ﴿فَلَمَّا عَتَوۡا عَنۡ مَّا نُہُوۡا عَنۡہُ قُلۡنَا لَہُمۡ کُوۡنُوۡا قِرَدَۃً خٰسِـِٕیۡنَ ﴿۱۶۶﴾﴾

"تو جب وہ بہت بڑھ گئے اس میں جس سے ان کو روکا گیا تھا' تو ہم نے ان سے کہہ دیا کہ جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ!"

آخر کار ان پر عذاب اس صورت میں آیا کہ ان کی انسانی شکلیں مسخ کر کے انہیں بندر بنا دیا گیا اور پھر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ یہ اس واقعہ کی تفصیل ہے جس کا اجمالی ذکر سورۃ البقرۃ اور سورۃ المائدۃ میں بھی آ چکا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عذاب ان گروہوں میں سے صرف اس گروہ پر آیا تھا جو گناہ میں براہِ راست ملوث تھا۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ نہی عن المنکر کرنے والے لوگوں کے بارے میں واضح طور پر بتا دیا گیا: ﴿اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ﴾ کہ ہم نے ان کو بچا لیا جو بدی سے روک رہے تھے اور جو گناہگار تھے ان کے بارے میں بھی صراحت سے بتا دیا گیا: ﴿وَاَخَذۡنَا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍۭ بَئِیۡسٍۭ﴾ کہ ہم نے پکڑ لیا اُن لوگوں کو جو گناہ میں ملوث تھے ایک بہت ہی برے عذاب میں۔ جب کہ تیسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر کوئی شخص براہِ راست کسی گناہ کا ارتکاب کرنے سے بچا رہتا ہے تو فریضہ نہی عن المنکر میں کوتاہی ہونے کی صورت میں بھی وہ دنیا میں اس گناہ کی پاداش میں آنے والے عذاب سے بچ جائے گا۔ یہ نظریہ دراصل بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کے پیچھے وہ انسانی نفسیات کارفرما ہے جس کے تحت انسان ذمہ داری سے فرار چاہتا ہے اور پھر اس کے لیے دلیلیں ڈھونڈتا اور بہانے تراشتا ہے۔ اسی طرح کی بات کا تذکرہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۰۵ کی تشریح کے ضمن میں بھی ہو چکا ہے۔ اس آیت کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خصوصی خطبہ ارشاد فرمانا پڑا تھا کہ لوگو! تم ﴿عَلَیۡکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ ۚ لَا یَضُرُّکُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اہۡتَدَیۡتُمۡ ؕ﴾ کا بالکل غلط مفہوم سمجھ رہے ہو۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ دعوت و تبلیغ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہاری ذمہ داری نہیں ہے' بلکہ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ تم اس سلسلے میں اپنی پوری کوشش کرو' اپنا فرض ادا کرو' لیکن اس کے باوجود بھی اگر لوگ کفر یا گناہ پر اڑے رہیں تو پھر ان کا وبال تم پر نہیں ہوگا۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب فضل من اسلم علی یدیه رجل ' وکتاب المناقب' باب مناقب علی بن ابی طالب ...... وکتاب المغازی' باب غزوۃ خیبر۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة' باب من فضائل علی بن ابی طالب۔

یہاں اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ نہی عن المنکر نصِّ قرآنی کے مطابق فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس ماحول میں اللہ تعالیٰ کے کسی واضح حکم کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہو رہی ہو تو ان حالات میں گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کو نہ روکنا' نہی عن المنکر کا فرض ادا نہ کرنا' بذاتِ خود ایک جرم ہے۔ لہٰذا اس واقعہ میں ''اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا'' کے زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اگرچہ براہِ راست تو گناہ میں ملوث نہیں تھے' لیکن مجرموں کو گناہ کرتے ہوئے دیکھ کر خاموش تھے۔ اس طرح یہ لوگ اللہ کی نافرمانی سے لوگوں کو نہ روکنے کے جرم کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اس ضمن میں نصِّ قطعی کے طور پر ایک حدیثِ قدسی بھی موجود ہے اور ایک بہت واضح قرآنی حکم بھی۔

پہلے حدیث ملاحظہ فرمائیں' یہ حدیث مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنے مرتب کردہ خطبات جمعہ میں شامل کی ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا۔ قَالَ: ''یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھِمْ عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ)) قَالَ: ((فَقَالَ: اِقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَ عَلَیْھِمْ' فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ))(۱)

''اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو وحی کی کہ فلاں فلاں شہر کو اس کے باسیوں پر اُلٹ دو۔ جبرائیلؑ نے عرض کیا کہ پروردگار' اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے کبھی پلک جھپکنے کی دیر بھی تیری معصیت میں نہیں گزاری''۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''(اس پر) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُلٹو اس بستی کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر' اس لیے کہ اس کے چہرے کا رنگ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی میری غیرت کی وجہ سے متغیر نہیں ہوا۔''

یعنی اس کے سامنے میرے احکام پامال ہوتے رہے' شریعت کی دھجیاں بکھرتی رہیں اور یہ اپنی ذاتی پرہیزگاری کو سنبھال کر ذکر اذکار' نوافل اور مراقبوں میں مصروف رہا۔ یہ دوسروں سے بڑھ کر مجرم ہے!

اب اس سلسلے میں نص قرآنی کے طور پر سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ کا یہ واضح حکم بھی ملاحظہ کر لیجیے: ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَآصَّۃً ۚ﴾ ''اور ڈرو اس فتنہ

---

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکاۃ المصابیح ' کتاب الآداب' باب الامر بالمعروف' الفصل الثالث۔

(عذاب) سے جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر واقع نہیں ہوگا جو تم میں سے گنہگار ہیں''۔ یعنی جب کسی قوم میں بحیثیت مجموعی منکرات پھیل جائیں اور اس وجہ سے ان کے لیے اس دنیا میں کسی اجتماعی سزا کا فیصلہ ہو جائے تو پھر ایسی سزا کی لپیٹ میں صرف گنہگار لوگ ہی نہیں آئیں گے۔ اس لحاظ سے یہ بہت تشویش ناک بات ہے۔ مگر آیت زیر مطالعہ میں ﴿اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْھَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ﴾ کے الفاظ میں امید دلائی گئی ہے کہ جو لوگ اپنی استطاعت کے مطابق' آخری وقت تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انہیں بچا لے گا۔

آیت ۱۶۷ ﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْھِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ یَّسُوْمُھُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ﴾ ''اور (یاد کرو) جب آپؐ کے ربّ نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ لازماً مسلّط کرتا رہے گا ان پر قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو جو انہیں بدترین عذاب میں مبتلا کرتے رہیں گے۔''

﴿اِنَّ رَبَّکَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ ۚ وَ اِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱۶۷)﴾ ''یقیناً آپ کا رب سزا دینے میں بہت جلدی کرتا ہے اور یقیناً وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔''

اللہ تعالیٰ کی ایک شان تو یہ ہے کہ وہ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَام اور سَرِیْعُ الْعِقَاب ہے اور اس کی دوسری شان یہ ہے کہ وہ غَفُوْرٌ رَّحِیْم ہے۔ اب اس کا دار و مدار انسانوں کے طرزِ عمل پر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کی کس شان کا مستحق بناتے ہیں۔ اس آیت میں یہود کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے جس قانون اور فیصلے کا ذکر ہو رہا ہے وہ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ کی صورت میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

آیت ۱۶۸ ﴿وَقَطَّعْنٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ﴾ ''اور ہم نے انہیں زمین کے اندر منتشر کر دیا فرقوں کی صورت میں۔''

بنی اسرائیل کا یہ دورِ انتشار (Diaspora) ۷۰ عیسوی میں شروع ہوا' جب رومن جنرل ٹائٹس نے ان کے معبد ثانی (2nd Temple) کو شہید کیا (جو حضرت عزیر علیہ السلام کے زمانے میں دوبارہ تعمیر ہوا تھا)۔ ٹائٹس کے حکم سے یروشلم میں ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودیوں کو ایک دن میں قتل کیا گیا اور بچ جانے والوں کو فلسطین سے نکال باہر کیا گیا۔ چنانچہ

یہاں سے ملک بدر ہونے کے بعد یہ لوگ مصر‘ ہندوستان‘ روس اور یورپ کے مختلف علاقوں میں جا بسے۔ پھر جب امریکہ دریافت ہوا تو بہت سے یہودی خاندان وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ اس آیت میں ان کے اسی ’’انتشار‘‘ کی طرف اشارہ ہے کہ پوری دنیا میں انہیں منتشر کر دیا گیا اور اس طرح ان کی اجتماعیت ختم ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف وہ جہاں کہیں بھی گئے وہاں ان سے شدید نفرت کی جاتی رہی‘ جس کے باعث ان پر یورپ میں بہت ظلم ہوئے۔ عیسائیوں کی ان سے نفرت اور شدید دشمنی کا ذکر قرآن میں بھی ہے: ﴿فَاَغۡرَیۡنَا بَیۡنَہُمُ الۡعَدَاوَۃَ وَالۡبَغۡضَآءَ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ؕ﴾ (المائدۃ: ۱۴) ’’پس ہم نے ان کے درمیان عداوت اور بغض قیامت تک کے لیے ڈال دیا‘‘۔ یہ دشمنی یہودیوں کے اُن گستاخانہ عقائد کی وجہ سے تھی جو وہ حضرت مسیح اور حضرت مریم علیہما السلام کے بارے میں رکھتے تھے۔

پھر جنگ عظیم دوم میں ہٹلر کے ہاتھوں تو یہودیوں پر ظلم کی انتہا ہو گئی۔ اس کے حکم پر پورے مشرقی یورپ سے یہودیوں کو اکٹھا کر کے concentration camps میں جمع کیا گیا اور اِن کے اجتماعی قتل کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی‘ جس کے لیے لاکھوں لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے جدید آٹو میٹک پلانٹ نصب کیے گئے۔ چنانچہ مردوں‘ عورتوں اور بچوں کو اجتماعی طور پر ایک بڑے ہال میں جمع کیا جاتا‘ وہاں ان کے کپڑے اتروائے جاتے اور بال مونڈ دیے جاتے (بعد میں ان بالوں سے قالین تیار کیے گئے جو نازیوں نے اپنے دفتروں میں بچھائے)‘ اور پھر انہیں وہاں سے بڑے بڑے گیس چیمبرز میں داخل کر دیا جاتا۔ وہاں مرنے کے بعد مشینوں کے ذریعے سے لاشوں کا چورا کیا جاتا اور پھر خاص قسم کے کیمیکلز کی مدد سے انسانی گوشت کو ایک سیاہ رنگ کے سیال مادے میں تبدیل کر کے کھیتوں میں بطور کھاد استعمال کیا جاتا۔ یہ سب کچھ بیسویں صدی میں آج کے اس مہذب دور میں ہوا۔ اس طریقے سے ہٹلر کے ہاتھوں ساٹھ لاکھ یہودی قتل ہوئے۔ یہود کے اس قتل عام کو ’’Holocaust‘‘ کا نام دیا جاتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ساٹھ لاکھ کی تعداد مبالغے پر مبنی ہے‘ اصل تعداد چالیس لاکھ تھی۔ چالیس لاکھ ہی سہی‘ اتنی بڑی تعداد میں قتل عام قومی سطح پر کتنا دردناک عذاب ہے! یہ ان کی تاریخ کے اب تک کے حالات و واقعات میں سے ﴿مَنۡ یَّسُوۡمُہُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ ؕ﴾ کی ایک جھلک ہے۔ اور اس سلسلے میں قیامت تک مزید کیا کچھ ہونے والا ہے اس کی خبر ابھی پردۂ غیب میں ہے۔

بہر حال یہودیوں کا آخری وقت بہت جلد آنے والا ہے‘ مگر جیسے چراغ کا شعلہ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے‘ بالکل اسی انداز سے آج کل ہمیں ان کی حکومت اور طاقت نظر آ رہی ہے۔ اور شاید یہ سب کچھ اس لیے بھی ہو رہا ہے کہ عربوں (جو حضور اکرم ﷺ کے مخاطب اول اور وارثِ اوّل ہونے کے باوجود دین سے پیٹھ پھیرنے کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں) کو ایک ’’مغضوب علیھم‘‘ قوم کے ہاتھوں ہزیمت سے دو چار کر کے سزا دینا اور ’’to add insult to injury‘‘ کے مصداق اس ذلیل قوم کے ہاتھوں عربوں کی تذلیل مقصود ہے۔ اندریں حالات ایسا نظر آتا ہے کہ وہ دن اب زیادہ دور نہیں جب مسجدِ اقصیٰ شہید کر دی جائے گی اور اس کے نتیجے میں مشرقِ وسطیٰ میں جو طوفان اٹھے گا وہ یہودیوں کا سب کچھ بہا کر لے جائے گا‘ لیکن ان کے اس سلسلۂ عذاب کی آخری شکل حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کے بعد سامنے آئے گی۔ جیسے پہلے تمام رسولوں کے منکرین ان کی موجودگی میں ختم کر دیے گئے تھے (چھ رسولوں اور ان کی قوموں کے واقعات تکرار کے ساتھ قرآن میں آئے ہیں) اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکرین کو بھی ان کی موجودگی میں ختم کیا جائے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف اللہ کے رسول تھے: ﴿وَرَسُوۡلًا اِلٰی بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ....﴾ (آلِ عمران: ۴۹)۔ یہودی نہ صرف آپؑ کے منکر ہوئے بلکہ (بزعمِ خویش) انہوں نے آپؑ کو قتل بھی کر دیا۔ لہٰذا بحیثیت قوم ان کا اجتماعی استیصال بھی حضرت مسیح علیہ السلام ہی کے ہاتھوں ہوگا۔

﴿مِنۡہُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنۡہُمۡ دُوۡنَ ذٰلِکَ ۫﴾ ’’ان میں سے کچھ لوگ صالح ہیں اور کچھ وہ بھی ہیں جو دوسری طرح کے ہیں۔‘‘

﴿وَبَلَوۡنٰہُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۶۸﴾﴾ ’’ہم انہیں بھلائی اور برائی سے آزماتے رہے ہیں کہ شاید یہ لوگ لوٹ آئیں۔‘‘

آیت ۱۶۹ ﴿فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡکِتٰبَ یَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ ہٰذَا الۡاَدۡنٰی﴾ ’’لیکن ان کے بعد ایسے (ناخلف) جانشین کتاب (تورات) کے وارث ہو گئے جو اس حقیر دنیا کے ساز و سامان ہی کو حاصل کرتے ہیں‘‘

وہ ایسے لوگ ہیں جو حلال اور حرام سے بے نیاز ہو کر دُنیاوی مفادات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کو آخرت کے بارے میں کسی قسم کا خوف اور ڈر نہیں ہے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ﴾ ’’اور کہتے یہ ہیں کہ ہمیں تو بخش ہی دیا جائے گا۔‘‘

ان کا کہنا ہے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں‘ پیغمبروں کی اولاد ہیں‘ اللہ کے چہیتے ہیں‘ ہماری بخشش تو یقینی ہے۔ ہمارے لیے سب معاف کر دیا جائے گا۔

﴿وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ﴾ ’’اگر ایسا ہی اور سامان بھی ان کو دے دیا جائے تو (وہ بھی) لے لیں گے۔‘‘

﴿اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ﴾ ’’کیا ان سے عہد نہیں لیا گیا تھا کتاب (تورات) کی نسبت‘ کہ نہیں منسوب کریں گے اللہ سے کوئی بات مگر حق‘ اور انہوں نے پڑھ بھی لیا جو کچھ اس میں تھا۔‘‘

﴿وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (١٦٩)﴾ ’’اور یقیناً آخرت کا گھر تو بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی‘ تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟‘‘

آیت ۱۷۰ ﴿وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (١٧٠)﴾ ’’اور جن لوگوں نے کتاب کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھا اور نماز قائم کی‘ تو یقیناً ایسے مصلحین کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔‘‘

بنی اسرائیل میں نیک لوگ آخری وقت تک ضرور موجود رہے ہوں گے۔ ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ ان کا اجر ہم کسی صورت میں ضائع نہیں کریں گے۔

آیت ۱۷۱ ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ﴾ ’’اور یاد کرو جبکہ ہم نے پہاڑ کو ان کے اوپر ایسے اٹھا دیا تھا جیسے سائبان ہو‘ اور انہیں لگتا تھا کہ اب یہ ان پر گرنے ہی والا ہے۔‘‘

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (١٧١)﴾ ’’(ہم نے اس وقت ان سے کہا تھا کہ) تھام لو اس کو مضبوطی سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تا کہ تم (غلط روی سے) بچتے رہو۔‘‘

اب آخری تین رکوعوں میں فلسفۂ دین کے اعتبار سے بہت اہم مضامین آ رہے ہیں۔

آیات ۱۷۲ تا ۱۷۴

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

آیت ۱۷۲ ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ ’’اور یاد کرو جب نکالا آپؐ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسل کو‘‘

یہ واقعہ عالمِ ارواح میں وقوع پذیر ہوا تھا جبکہ انسانی جسم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اہلِ عرب جو اُس وقت قرآن کے مخاطب تھے اُن کی اُس وقت کی ذہنی استعداد کے مطابق یہ ثقیل مضمون تھا۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ انہیں پہلے تفصیل سے بتایا جاتا کہ انسانوں کی پہلی تخلیق عالمِ ارواح میں ہوئی تھی اور دنیا میں طبعی اجسام کے ساتھ یہ دوسری تخلیق ہے اور پھر بتایا جاتا کہ یہ میثاق عالمِ ارواح میں لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بجائے اس مضمون کو آسان پیرائے میں بیان کرنے کے لیے عام فہم الفاظ عام فہم انداز میں استعمال کیے گئے کہ جب ہم نے نسلِ آدم کی تمام ذرّیت کو ان کی پیٹھوں سے نکال لیا۔ یعنی قیامت تک اس دنیا میں جتنے بھی انسان آنے والے تھے‘ ان سب کی ارواح وہاں موجود تھیں۔

﴿وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ﴾ ’’اور ان کو گواہ بنایا خود ان کے اوپر‘ (اور سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟‘‘

یعنی پوری طرح ہوش و حواس اور خود شعوری (self conciousness) کے ساتھ یہ اقرار ہوا تھا۔ اس نکتے کی وضاحت اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے کہ انسان کی خود شعوری (self conciousness) ہی اسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے جن میں شعور (conscious) تو ہوتا ہے لیکن خود شعوری نہیں ہوتی۔ انسان کی اس خود شعوری کا تعلق اس کی روح سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے بطورِ خاص صرف انسان میں پھونکی ہے۔ چنانچہ جب یہ عہد

لیا گیا تو وہاں تمام ارواح موجود تھیں اور انہیں اپنی ذات کا پورا شعور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ارواحِ انسانیہ سے یہ سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب‘ تمہارا مالک‘ تمہارا آقا نہیں ہوں؟

﴿قَالُوْا بَلٰی ۚ شَهِدْنَا ۚ﴾ ’’انہوں نے کہا کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔‘‘

تمام ارواح نے یہی جواب دیا کہ تو ہی ہمارا رب ہے‘ ہم اقرار کرتے ہیں‘ ہم اس پر گواہ ہیں۔ اب یہاں نوٹ کیجیے کہ یہ اقرار تمام انسانوں پر اللہ کی طرف سے حجت ہے۔ جیسے کہ اس سے پہلے سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۹ میں آ چکا ہے: ’’اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آ چکا ہے ہمارا رسول جو تمہارے لیے (دین کو) واضح کر رہا ہے‘ رسولوں کے ایک وقفے کے بعد‘ مبادا تم یہ کہو کہ ہمارے پاس تو آیا ہی نہیں تھا کوئی بشارت دینے والا اور نہ کوئی خبردار کرنے والا‘‘۔ تو یہ گویا اتمامِ حجت تھی اہلِ کتاب پر۔ اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۶ میں فرمایا: ’’مبادا تم یہ کہو کہ کتابیں تو دی گئی تھیں ہم سے پہلے دو گروہوں کو اور ہم تو ان کتابوں کو (غیر زبان ہونے کی وجہ سے) پڑھ بھی نہیں سکتے تھے‘‘۔ تو یہ اتمامِ حجت کیا گیا بنی اسماعیل پر کہ اب تمہارے لیے ہم نے اپنا ایک رسول (ﷺ) تم ہی میں سے بھیج دیا ہے اور وہ تمہارے لیے ایک کتاب لے کر آیا ہے جو تمہاری اپنی زبان ہی میں ہے۔ لہٰذا اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے اپنی کتابیں تو ہم سے پہلے والی اُمتوں پر نازل کی تھیں‘ اور یہ کہ اگر ہم پر بھی کوئی ایسی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے کہیں بڑھ کر ہدایت یافتہ ہوتے۔ آیت زیر نظر میں جس گواہی کا ذکر ہے وہ پوری نوعِ انسانی کے لیے حجت ہے۔ یہ عہد ہر روحِ انسانی اللہ سے کر کے دنیا میں آئی ہے اور اُخروی مواخذے کی اصل بنیاد یہی گواہی فراہم کرتی ہے۔ نبوت‘ وحی اور الہامی کتب کے ذریعے جو اتمامِ حجت کیا گیا‘ وہ تاکید مزید اور تکرار کے لیے اور لوگوں کے امتحان کو مزید آسان کرنے کے لیے کیا گیا۔ لیکن حقیقت میں اگر کوئی ہدایت بذریعہ نبوت‘ وحی وغیرہ نہ بھی آتی تو روزِ محشر کے عظیم محاسبہ (accountability) کے لیے عالمِ ارواح میں لیا جانے والا یہ عہد ہی کافی تھا جس کا احساس اور شعور ہر انسان کی فطرت میں سمو دیا گیا ہے۔

﴿اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝۱۷۲﴾ ’’مبادا تم یہ کہو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے غافل تھے۔‘‘

آیت ۱۷۳ ﴿اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ﴾ ’’یا تم یہ کہو کہ شرک تو پہلے ہمارے آباء واجداد نے کیا تھا‘ اور ہم ان کے بعد ان کی نسل

میں سے تھے۔‘‘

﴿اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۱۷۳﴾ ’’تو (پروردگار!) کیا تو ہمیں ہلاک کرے گا ان باطل پسند لوگوں کے فعل کے بدلے میں؟‘‘

ہمارے بڑے جو راستہ‘ جو طور طریقے چھوڑ گئے تھے‘ ہم تو ان پر چلتے رہے‘ لہٰذا ہمارا کوئی قصور نہیں‘ اصل مجرم تو وہ ہیں جو ہمیں اس دلدل میں پھنسا کر چلے گئے۔ یہ باطل طور طریقے انہوں نے ہی ایجاد کیے تھے‘ ہم تو صرف ان کے مقلّد تھے۔

آیت ۱۷۴ ﴿وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۱۷۴﴾ ’’اور ہم اسی طرح اپنی آیات کو تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں تاکہ وہ رجوع کریں۔‘‘

اب آئندہ آیات میں ایک شخصیت کا واقعہ تمثیلی انداز میں بیان ہوا ہے‘ مگر حقیقت میں یہ محض تشبیہہ نہیں ہے بلکہ حقیقی واقعہ ہے۔ یہ قصہ دراصل ہمارے لیے درسِ عبرت ہے‘ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت بدنصیب ہے وہ فرد یا قوم جس کو اللہ تعالیٰ اپنے بیش بہا انعام واکرام اور قربِ خاص سے نوازے‘ مگر وہ اس کی نافرمانی کا ارتکاب کر کے خود کو ان تمام فضیلتوں سے محروم کر لے اور اللہ کی بندگی سے نکل کر شیطان کا چیلہ بن جائے۔

آیات ۱۷۵ تا ۱۷۸

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ
مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ
هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ
ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ
يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ سَآءَ مَثَلَا ِۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا
يَظْلِمُوْنَ ۝ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ۝

آیت ۱۷۵ ﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا﴾ ’’اور سنایئے انھیں خبر اُس شخص کی جس کو ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں‘‘

یہاں پر اس واقعے کے لیے لفظ ''نبأ'' استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی ''خبر'' کے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کوئی تمثیل نہیں بلکہ حقیقی واقعہ ہے۔ دوسرے جو یہ فرمایا گیا کہ اس شخص کو ہم نے اپنی آیات عطا کی تھیں' اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ شخص صاحبِ کرامت بزرگ تھا۔ اس واقعے کی تفصیل ہمیں تورات میں بھی ملتی ہے جس کے مطابق یہ شخص بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اس کا نام بلعم بن باعوراء تھا اور یہ ایک بہت بڑا عابد' زاہد اور عالم تھا۔

﴿فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ﴾ ''تو وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا''

یہاں پر یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ پہلے انسان خود غلطی کرتا ہے' شیطان اسے کسی برائی پر مجبور نہیں کرسکتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (۴۲)﴾ (الحجر) شیطان کو کسی بندے پر کوئی اختیار حاصل نہیں' لیکن جب بندہ اللہ کی نافرمانی کی طرف لپکتا ہے اور برائی کر بیٹھتا ہے تو وہ شیطان کا آسان شکار بن جاتا ہے۔ شیطان ایسے شخص کے پیچھے لگ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ کرکے رجوع نہ کرے تو اسے تدریجاً دُور سے دُور لے جاتا ہے یہاں تک کہ اسے برائی کی آخری منزل تک پہنچا کر دم لیتا ہے۔

﴿فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (۱۷۵)﴾ ''تو وہ ہوگیا گمراہوں میں سے۔''

آیت ۱۷۶ ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ ''اور اگر ہم چاہتے تو ان (آیات) کے ذریعے سے اسے اور بلند کرتے مگر وہ تو زمین کی طرف ہی دھنستا چلا گیا''

یعنی اللہ کی آیات اور جو بھی علم اس کو عطا ہوا تھا اس کے ذریعے سے اس کو بڑا بلند مقام مل سکتا تھا مگر وہ تو زمین ہی کی طرف دھنستا چلا گیا۔ یہاں پر زمین کی طرف دھنسنے کے استعارے کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انسان دراصل حیوانی جسم اور ملکوتی روح سے مرکب ہے۔ جسم کے اجزائے ترکیبی کا تعلق زمین سے ہے' جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵۵ میں فرمایا گیا: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ﴾ یعنی ہم نے تمہیں اس زمین سے پیدا کیا۔ اس کے برعکس انسانی روح کا تعلق عالمِ بالا سے ہے اور وہ اللہ سے ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ والا عہد کر کے آئی ہے۔ چنانچہ اصل کے اس تضاد کی بنیاد پر جسم اور روح میں متواتر کشمکش رہتی ہے۔ ''كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ'' (ہر چیز اپنے منبع کی طرف لوٹتی ہے) کے مصداق رُوح اُوپر اٹھنا چاہتی ہے تاکہ اللہ سے قرب حاصل کر سکے' جبکہ جسم کی ساری کشش زمین کی طرف ہوتی ہے۔ چونکہ جسم

کی تقویت کا سارا سامان' غذا وغیرہ زمین ہی کے مرہونِ منّت ہے' اس لیے زمینی اور دنیاوی لذتوں میں ہی اسے سکون ملتا ہے اور ع ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کا نعرہ اسے اچھا لگتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص فیصلہ کر لیتا ہے کہ جسمانی ضرورتوں اور لذتوں کے حصول کے لیے اس نے زمین کے ساتھ ہی چمٹ کر رہنا ہے تو گویا اب اس نے اپنے آپ کو اللہ کی توفیق سے محروم کر لیا۔ اب اس کی روح سسکتی رہے گی' احتجاج کرتی رہے گی اور اگر زیادہ مدت تک اس کی روحانی غذا کا بندوبست نہیں کیا جائے گا تو روح کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اگر کسی انسان کے جیتے جی اس کی روح کے ساتھ یہ حادثہ ہو جائے' یعنی اس کی روح کی موت واقع ہو جائے تو گویا وہ چلتا پھرتا حیوان بن جاتا ہے' جو اپنے سارے حیوانی تقاضے حیوانی انداز میں پورے کرتا رہتا ہے۔ پھر زمینی غذائیں' سِفلی آرزوئیں اور مادی امنگیں ہی اس کی زندگی کا مقصد و محور قرار پاتی ہیں۔ نتیجتاً اسے فیضانِ سماوی اور توفیق الٰہی سے کُلّی طور پر محروم کر دیا جاتا ہے۔

﴿وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ﴾ ''اور اس نے پیروی کی اپنی خواہشات کی۔''

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾ ''تو اس کی مثال کتے کی سی ہے' اگر تم اس کے اوپر بوجھ رکھو تب بھی ہانپے گا اور اگر چھوڑ بھی دو تب بھی ہانپتا رہے گا۔''

یعنی اس شخص نے اللہ کی نعمتوں کی قدر کرنے کے بجائے خود کو کتے سے مشابہ کر لیا' جو ہر وقت زبان نکالے ہانپتا رہتا ہے اور حرص و طمع کے غلبے کی وجہ سے ہر وقت زمین کو سونگھتے رہنا اس کی فطرت میں شامل ہے۔

﴿ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ ''یہی مثال ہے اُس قوم کی (بھی) جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔''

اوپر تفصیل کے ساتھ یہود کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قوم شروع سے ہی بلعم بن باعوراء بنی رہی ہے۔ آج اس کی سب سے بڑی مثال پاکستانی قوم ہے۔ پاکستان کا بن جانا اور اس کا قائم رہنا ایک معجزہ تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں کو یقین تھا کہ پاکستان کی بقا بحیثیت ایک آزاد اور خود مختار ملک کے ممکن نہیں ہے' اس لیے یہ جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن یہ ملک نہ صرف قائم رہا بلکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ جیسی بڑی بڑی آزمائشوں سے بھی سرخرو ہو کر نکلا۔ اس لیے کہ ہم نے اس ملک کو حاصل کیا تھا اسلام کے نام پر کہ اسے اسلامی

نظام کی تجربہ گاہ بنائیں گے، تاکہ پوری دنیا اسلامی نظام کے عملی نمونے اور اس کی برکات کا مشاہدہ کر سکے۔ قائداعظم نے بھی فرمایا تھا کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ ہم عہد حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں، لیکن عملی طور پر آج ہمارا طرزِ عمل ’’فَانۡسَلَخَ مِنۡهَا‘‘ کی عبرتناک تصویر بن چکا ہے۔ ہم ان تمام وعدوں سے پیچھا چھڑا کر نکل بھاگے اور شیطان کی پیروی اختیار کی۔ پھر ہمارا جو حال ہوا اور مسلسل ہو رہا ہے وہ سامنے رکھیں اور اس پس منظر میں اس آیت کو دوبارہ پڑھیں۔

﴿فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ۝۱۷۶﴾ ’’سو (اے نبی ﷺ!) آپ یہ واقعات سنا دیجیے، شاید کہ یہ تفکر کریں۔‘‘

آیت ۱۷۷ ﴿سَآءَ مَثَلَا ِۨ الۡقَوۡمُ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاَنۡفُسَهُمۡ كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ ۝۱۷۷﴾ ’’کیا ہی بری مثال ہے اُس قوم کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اور وہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔‘‘

آیت ۱۷۸ ﴿مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِىۡ‌ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۝۱۷۸﴾ ’’جسے اللہ ہدایت دیتا ہے وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے، اور جنہیں وہ گمراہ کر دے تو وہی لوگ تباہ ہونے والے ہیں۔‘‘

’’عہدِ الست‘‘ کے حوالے سے ہم پر یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان کا ایک وجود روحانی ہے اور دوسرا مادی یعنی حیوانی۔ اگر انسان کی توجہ اور ساری دلچسپیاں حیوانی وجود کی ضروریات پوری کرنے تک محدود رہیں گی تو پھر وہ بلعم بن باعوراء کی مثال بن جائے گا۔ یہ انفرادی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور قومی و اجتماعی سطح پر بھی۔ اس ضمن میں حکمت قرآنی کا تیسرا نکتہ اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے کہ انسانوں میں سے اکثر وہ ہیں جو صرف اپنے حیوانی جسم کی پرورش میں مصروف ہیں۔ وہ اگرچہ بظاہر تو انسان ہی نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

پاکستان کے موجودہ مسائل اور اُن کا حل

قرآن و سُنّت کی روشنی میں

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

تنظیم اسلامی لاہور کے زیر اہتمام ۲۳/اکتوبر ۲۰۱۱ء کو الحمراہال نمبر ۱ میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ نے ''پاکستان کے موجودہ مسائل اور ان کا حل'' کے عنوان سے خصوصی خطاب فرمایا۔ قرآن اکیڈمی شعبہ مطبوعات کے ادارتی معاون حافظ محمد زاہد کی ترتیب وتسوید اور جناب محبوب الحق عاجز کی نظر ثانی کے بعد یہ خطاب قارئین میثاق کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ ٭ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ؕ (البقرۃ:۶۱)

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرۡیَۃً کَانَتۡ اٰمِنَۃً مُّطۡمَئِنَّۃً یَّاۡتِیۡہَا رِزۡقُہَا رَغَدًا مِّنۡ کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتۡ بِاَنۡعُمِ اللّٰہِ فَاَذَاقَہَا اللّٰہُ لِبَاسَ الۡجُوۡعِ وَالۡخَوۡفِ بِمَا کَانُوۡا یَصۡنَعُوۡنَ ۝۱۱۲ (النحل)

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا ؕ (التحریم:۸)

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّیۡطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمۡ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ۝۲۰۸ (البقرۃ)

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡۤا اَنۡصَارَ اللّٰہِ (الصّف:۱۴)

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَکُمۡ ۝۷ (محمد)

اِنۡ یَّنۡصُرۡکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمۡ ۚ وَاِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ وَعَلَی اللّٰہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱۶۰ (آل عمران)

محترم ومعزز حضرات اور قابلِ احترام خواتین!

میرا آج کا موضوع ہے: ''پاکستان کے موجودہ مسائل اور ان کا حل''۔ یہ موضوع آج کل زبان زدِ خاص و عام ہے اور اس عنوان سے ایوانِ وقت سمیت مختلف فورمز پر بے شمار سیمینارز اور مذاکرے منعقد ہو رہے ہیں۔ البتہ اس ضمن میں آج ہمارا اندازِ گفتگو تھوڑا سا مختلف ہے۔ اس کا عنوان اس طرح ہوگا: ''پاکستان کے موجودہ مسائل اور ان کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں''۔ یعنی درپیش مسائل کے حل کے لیے اپنی منطق اور اپنا فلسفہ بگھارنا مقصود نہیں ہے بلکہ ساری راہنمائی قرآن وسنت سے لینی ہے۔ بقول اقبال ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف!

ہمارے لیے راہنمائی کے اصل ذرائع (sources) اور منابع قرآن وسنت ہی ہیں۔ چنانچہ ساری گفتگو اسی پیرائے میں ہوگی، البتہ اضافی طور پر دو اعتبارات سے علامہ اقبال کا بھی حوالہ آئے گا۔ ایک یہ کہ گفتگو پاکستان کی ہو رہی ہے اور اقبال مفکّر ومصوّرِ پاکستان بلکہ اس سے بڑھ کر حکیم الامت بھی ہیں۔ انہوں نے صرف پاکستان کا تصور ہی نہیں دیا بلکہ پوری اُمت کی بات کی۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اس دور کے سب سے بڑے ''ترجمان القرآن'' ہیں۔ یہ خطاب ان کو والد محترم بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے دیا اور اُن کی اِس حیثیت کا اعتراف وہ علماء کرام بھی کرتے ہیں جنہوں نے باقاعدہ کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ؒ نے اقبال پر ایک مکمل کتاب لکھی ہے۔ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبال کا کلام قرآن وسنت کی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ رہنمائی کے اصل ذرائع قرآن وسنت کے ہوتے ہوئے اگر ہم کہیں اور سے راہنمائی حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں رہنمائی ہرگز نہیں ملے گی۔ پھر یہ کہ یہ طرزِ عمل درحقیقت قرآن حکیم کی توہین کے مترادف ہوگا۔ اس طرزِ عمل پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بڑی سخت وعید آئی ہے۔ حضرت علی ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَمَنِ ابۡتَغَی الۡھُدٰی مِنۡ غَیۡرِہٖ اَضَلَّہُ اللّٰہُ)) (رواہ الترمذی والدارمی)

''اور جو کوئی قرآن کو چھوڑ کر کہیں اور سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کرنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اسے گمراہ کر کے چھوڑے گا۔''

پاکستان کے داخلی و خارجی مسائل

میرے موضوع کا پہلا حصہ ’’پاکستان کے موجودہ مسائل‘‘ ہے۔ یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ پاکستان کے داخلی مسائل اور مشکلات ہوں یا خارجی معاملات اور سرحدوں کے مخدوش حالات‘ ہم اس وقت ہر اعتبار سے تاریخ کے سنگین ترین بحرانی دور سے گزر رہے ہیں۔ اب لوگوں کی زبانوں پر یہ الفاظ بھی آنے لگے ہیں کہ پاکستان کی سالمیت کو خطرہ ہے۔ اِس بات سے ظاہر ہے کہ ہمیں صرف عدم استحکام ہی کا سامنا نہیں بلکہ ملک کی سالمیت اور بقا کا چیلنج بھی درپیش ہے۔ ملک کے حوالے سے امریکہ اور نیٹو کے عزائم اور یہود و نصاریٰ کا جو ایجنڈا ہے‘ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے‘ کھلا راز بلکہ نوشتہ دیوار ہے۔

داخلی طور پر ہم بدحالی کی آخری انتہاؤں کو چھو رہے ہیں۔ نائن الیون کے بعد امریکہ سے تعاون کی ناروا پالیسی کے حوالے سے ہمارا دانشور اور سیکولر طبقہ یہ کہتا ہے کہ اگر اُس وقت ہم امریکہ کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکتے‘ اس سے وفاداری کا دم نہ بھرتے تو آج ہمارا تورا بورا ہو چکا ہوتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ احمقانہ پالیسی اپنا کر کیا ہم تورا بورا ہونے سے بچ گئے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تعاون کے باوجود ہر اعتبار سے ہمارا تورا بورا ہو چکا ہے؟ معاشی ابتری انتہا درجے کو ہے۔ ہماری قوم اس وقت بھکاری بن چکی ہے‘ جس نے ہاتھ میں کشکول تھام رکھا ہے۔ پھر ہم پر ہر وقت ورلڈ بینک کی تلوار لٹکی رہتی ہے اور وہ جو شرائط چاہتے ہیں ہم سے منواتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی حکومت کے ہوتے ہوئے ہر دوسرے روز انہی کی ڈکٹیشن پر مہنگائی کا بم گرایا جاتا ہے۔ ملک میں توانائی کا بھی شدید بحران ہے اور بجلی کی لوڈ شیڈنگ اپنی حدوں کو چھو رہی ہے‘ جس کے نتائج میں سرفہرست انڈسٹری اور زراعت کی تباہی ہے۔ کرپشن اس درجے میں ہے کہ جسے چند دن کا اقتدار و اختیار بھی حاصل ہو جاتا ہے اس کا اصل کام ہی یہ ہوتا ہے کہ ان چار دنوں میں زیادہ سے زیادہ مال سمیٹ سکے۔ ملک میں مہنگائی اور بے روزگاری عروج پر ہے۔ ملکی ادارے تباہ ہو رہے ہیں۔ ریلوے کا پہیّہ جام ہو گیا ہے۔ پی آئی اے دم توڑ رہی ہے۔ ملکی سیاست بدحالی کی طرف گامزن ہے۔ ہر طرف بے اصولی اور لوٹ مار ہے‘ حکمرانوں نے عدلیہ کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے۔ اس کے علاوہ داخلی طور پر صوبوں بالخصوص بلوچستان میں علیحدگی پسند تحریکیں سر اٹھا رہی ہیں۔ کراچی کے حوالے سے جو انکشافات ذوالفقار مرزا نے گزشتہ دنوں کیے ہیں‘ اس کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہاں کیا گیم چل رہی ہے۔ ملک میں دہشت گردی‘ ٹارگٹ کلنگ اور بدامنی عروج پر ہے‘ جس کی بنا پر غیر ملکی باشندے اور اوورسیز پاکستانی یہ سوچتے ہیں کہ یہ ملک اب رہنے کے قابل نہیں رہا۔ وہ اپنے رشتہ داروں کے بارے میں پریشان ہیں کہ نہ جانے یہاں کیسے رہتے ہیں۔

یہ تو داخلی مسائل کی محض ایک جھلک تھی‘ ورنہ مسائل تو اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ دوسری طرف خارجی محاذ پر دیکھئے‘ بھارت ہماری مشرقی سرحد پر گھات لگائے بیٹھا ہے کہ جیسے ہی مناسب موقع ملے پاکستان پر حملہ کر دے اور ہماری بے حمیتی کا یہ عالَم ہے کہ ہم نے اسے ’’پسندیدہ ترین ملک‘‘ (the most favourite nation) قرار دے دیا ہے۔ بھارت ہماری پیٹھ میں خنجر گھونپنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ وہ ہمارے آبی وسائل کو کنٹرول میں لا کر پاکستان کے لیے اتنی خوفناک صورت حال پیدا کر دے گا جس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے ہائیڈروجن بم کے حملے سے کم خطرناک نہ ہو گی۔ پھر ہم پر امریکہ کا دباؤ انتہا درجے کو پہنچا ہوا ہے‘ جس کا اندازہ آپ گزشتہ دنوں ہونے والی پاک امریکہ اعلیٰ سطحی میٹنگ سے لگا سکتے ہیں‘ جس میں امریکہ کی اعلیٰ سیاسی و عسکری قیادت‘ جیسے وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن‘ وائٹ ہاؤس کے خصوصی نمائندے‘ اوباما کے مشیر‘ امریکہ کی طرف سے پاک افغان معاملات کے انچارج‘ اور امریکن آرمی چیف موجود تھے۔ پاکستان کے ساتھ امریکیوں کی اس لیول کی میٹنگ شاید ہی اس سے پہلے کبھی ہوئی ہو۔ یہ دراصل دباؤ ڈالنے کے آخری حربے ہیں۔ امریکہ ہمارے بازو مروڑ کر اپنے ایجنڈے کی تکمیل چاہتا ہے۔ اسے افغانستان سے ذلّت کے ساتھ نکلنا پڑ رہا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ پاکستان کو بھی براہِ راست اس جنگ میں اُلجھا دے۔ اس کا اصل ٹارگٹ ’’اسلام بحیثیت دین‘‘ ہے —— اسے مسلمان کے نماز روزہ سے کوئی خوف نہیں ہے۔ اس کا مسئلہ اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی ہے۔ وہ ’’ربّ کی دھرتی پر ربّ کا نظام‘‘ برداشت نہیں کر سکتا۔ اِسی مقصد کے لیے اس نے افغانستان پر جنگ مسلّط کی تاکہ اسلام کا راستہ روک سکے اور اب اسے اندیشہ ہے کہ اس کی افغانستان سے رسوا کن واپسی کے بعد اس علاقے میں دوبارہ طالبان برسرِ اقتدار آ جائیں گے جو پورے افغانستان میں شریعت اسلامی نافذ کریں گے‘ اور یہ نظام شرعی بہت مستحکم ہوگا‘ جس کے اثرات پاکستان پر بھی پڑیں گے اور یہاں بھی نفاذِ شریعت کی تحریک چلے گی۔ لہٰذا اسلام کا ممکنہ احیاء روکنے کے لیے وہ ہم پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈال رہا ہے۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی فوجیں ہماری سرحدوں پر لا کھڑی

کی ہیں۔ اب اس کی توپوں کا رخ براہِ راست ہماری طرف ہے۔ وہ ہم پر جنگ مسلّط کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہے ہمارا وہ ’’محسن‘‘ جس کی خاطر ہم نے اپنا سب کچھ قربان کیا‘ جس کی تفصیل اتنی لمبی‘ اتنی سنگین اور اتنی شرمناک ہے کہ اسے بیان کرنا ممکن نہیں۔ اب یہی امریکہ احسان فراموش بن کر آج ہماری گردن دبوچ رہا ہے ؏ ’’دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!‘‘

دو اہم سوال

اب تک جو کچھ کہا گیا یہ موجودہ مخدوش حالات کا خلاصہ تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم ان مسائل کے حل کی طرف بڑھیں‘ دو اہم سوالات پر غور کرنا ضروری ہے‘ ایک یہ کہ ہم اس بدترین اور سنگین صورتحال سے دوچار کیوں ہوئے؟ دوسرے اس پستی اور زوال کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ بقول شاعر ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

اور ؎

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

سب سے پہلے ہمیں ان سوالوں کا جواب تلاش کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ علاج سے پہلے صحیح تشخیص ضروری ہے اور تشخیص کے لیے ہمیں ٹھنڈے دل سے ساری صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا اور حالات کا صحیح ادراک کرنا ہوگا۔

پاکستان: اللہ کا معجزہ اور عظیم نعمت

اس حوالے سے ایک رائے یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شاید پاکستان کا بننا ہی غلط تھا۔ بقولِ شاعر ؏ ’’مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی!‘‘ اور جب ہماری بنیاد ہی غلط تھی تو پھر تو یہ ہونا ہی تھا۔ اس بارے میں واضح کر دیا جائے کہ اس ملک کی بنیاد ہرگز غلط نہیں۔ پاکستان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے اور یہ ہمیں معجزانہ طور پر عطا ہوا ہے۔ اور بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اس ملک کا قیام عظیم خدائی منصوبے کے تحت عمل میں آیا ہے۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی کتاب ’’استحکامِ پاکستان‘‘ اور دوسری کتب کے علاوہ متعدد خطابات میں اپنے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ احادیث میں قیامت سے قبل اسلام کے عالمی غلبے کی جو پیشین گوئی آئی ہے‘ اُس کے ضمن میں اللہ نے اس خطے سے کوئی خاص کام لینا ہے۔ یہیں سے احیاءِ اسلام کا آغاز ہوگا۔ وہ سمجھتے تھے کہ افغانستان میں شریعت کا نفاذ اسلام کے اسی عالمی غلبے کی تمہید ہے۔

اس حوالے سے دوسری گواہی ایک انگریز صحافی کی ہے۔ جب تقسیمِ ہند کو چالیس برس پورے ہوئے تو برطانیہ کے اخبار ’’ٹائم آف لندن‘‘ کے ایڈیٹر نے اپنے اداریہ میں لکھا کہ آج سے چالیس سال پہلے انگریزوں نے برصغیر کو آزاد کیا اور دو ملک وجود میں آئے: ہندوستان اور پاکستان۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ تقسیم ہند کے وقت ٹائم آف لندن کے ایڈیٹر نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا کہ ان دونوں ممالک میں سے ایک ملک کا مستقبل بہت روشن ہے اور ایک کا تاریک۔ روشن مستقبل کا حامل پاکستان ہے۔ اس کی وجہ اس نے یہ بیان کی تھی کہ جو لوگ یہاں بستے ہیں ان کی عظیم اکثریت ایک ہی نظریے کی حامل ہے اور ان کا مقصدِ حیات بھی ایک ہی ہے۔ جب کسی ملک کی اکثریت ایک نظریے پر ہو تو اسے نہ تو کوئی شکست دے سکتا ہے اور نہ اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ دوسری طرف ہندوستان ’’مسائلستان‘‘ ہے۔ وہاں بے شمار مذاہب کے لوگ موجود ہیں‘ مثلاً جین مت اور بدھ مت کے پیرو‘ سکھ‘ مسلمان‘ پارسی‘ عیسائی وغیرہ۔ پھر وہاں بیسیوں زبانیں اور ثقافتیں ہیں۔ اس صورت حال میں وہاں مسائل کا ایک ملغوبہ ہے۔ والد محترم اور ایک انگریز صحافی کے حوالے سے جو بات واضح کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کی بنیاد غلط نہیں‘ بالکل صحیح تھی اور اس کی ترقی کے بھی روشن امکان تھے۔ چالیس سال گزرنے کے بعد اسی اخبار کا ایڈیٹر اپنے اداریہ میں لکھتا ہے کہ جو بات چالیس سال پہلے کہی گئی تھی‘ آج کا نقشہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ آج پاکستان تباہ حال ہے‘ اس کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ حالانکہ بات بالکل واضح ہے کہ بقول اقبال ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

ملت اسلامیہ اور مسلمان قوم کی ترقی و تنزل کے قواعد و ضوابط ہی کچھ اور ہیں‘ جن کو ایک جملے میں بایں الفاظ بیان کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان اگر اللہ عزوجل‘ اس کے رسول ﷺ اور اس کے دین کے وفادار رہیں تو کوئی بھی ان پر غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ وفاداری کی بجائے بے وفائی کریں تو پھر ان سے بدتر حالات میں کوئی نہ ہوگا۔

پاکستان کے بدترین حالات — ذمّہ دار کون؟

اب آیئے‘ دوسرے سوال کی طرف کہ اس ساری صورتحال کا ذمہ دار کون ہے؟ ہمارے ہاں ایک دوسرے کو الزام دینے کا بہت رواج ہے۔ ہماری دینی سیاسی جماعتیں خرابی بسیار کا سارا الزام حکمران طبقہ کو دیتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پچھلے ۶۴ برس سے ہم پر ایک ایسا سیکولر طبقہ

مسلّط ہے جو اسلام دشمن بھی ہے اور عوام دشمن بھی‘ جبکہ عوام سچّے پکّے مسلمان ہیں اور ان کے اندر دینی جذبہ موجزن ہے۔ دوسری طرف سیکولر طبقات کہتے ہیں کہ اصل مجرم مذہبی طبقات ہیں‘ ان کے فرقہ وارانہ جھگڑے اور اختلافات خرابی کی اصل جڑ ہیں۔ ایک اور طبقے کی سوچ یہ ہے کہ اصل خرابی دانشور طبقے نے پیدا کی ہے۔ کچھ لوگ فوج کو الزام دیتے ہیں کہ بار بار کا مارشل لاء خرابی کی اصل وجہ ہے۔ الغرض ایک دوسرے کو الزام دیا جا رہا ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ خرابی حالات کے لیے ایک ہی طبقہ کو موردِ الزام ٹھہرانا درست رویہ نہیں‘ بلکہ اجتماعی بگاڑ میں سب ہی کا حصہ ہے۔ سیاسی قیادتیں یقیناً اس کی ذمہ دار ہیں‘ ہم ان کو الزام سے بَری نہیں کر سکتے‘ لیکن سارا جرم انہی کا نہیں ہے۔ اگر حکمران غلط ہیں تو اِس لیے کہ دین کے تعلق سے قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس لیے کہ حدیث رسول ﷺ کے مطابق جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسے ہی تم پر حکمران آ جائیں گے۔

عوام کے مجموعی کردار کے حوالے سے مجھے والد محترم کے وہ الفاظ یاد آ رہے ہیں جو انہوں نے ایک خطاب میں کہے تھے۔ انہوں نے فرمایا:

> ’’میں آج بڑے دکھ کے ساتھ کہہ رہا ہوں‘ لیکن میں اگر یہ الفاظ استعمال نہیں کروں گا تو آپ میرے اصل احساسات کو سمجھ نہیں سکیں گے‘ کہ آج مسلمانانِ پاکستان دنیا کی عظیم ترین منافق قوم ہے۔ اس منافقت کا ذرا حساب کر لیجیے۔ اس بارے میں دو احادیث نبوی پیش کر رہا ہوں جو دونوں متفق علیہ ہیں۔ پہلی حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ ؓ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:
>
> **((آیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ‘ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ‘ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))**
>
> وفی روایةٍ لمُسلمٍ:
>
> **((آیَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ: وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّہٗ مُسْلِمٌ))**
>
> ’’منافق کی تین نشانیاں ہیں: (i) جب بولے جھوٹ بولے (ii) جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے (iii) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔‘‘
>
> مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: ’’منافق کی تین نشانیاں ہیں‘ اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔‘‘
>
> دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
>
> **((اَرْبَعٌ مَنْ کُنَّ فِیْهِ کَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ کَانَتْ فِیْهِ خَصْلَةٌ**

> **مِنْهُنَّ کَانَتْ فِیْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰی یَدَعَهَا اِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَاِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))**
>
> ’’چار چیزیں اگر کسی میں ہوں تو وہ پکا منافق ہے اور اگر ان میں سے ایک ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے (وہ چار نشانیاں یہ ہیں) (i) جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے (ii) جب بات کرے تو جھوٹ بولے (iii) جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے (iv) جب کسی سے جھگڑ پڑے تو آپے سے باہر ہو جائے (یعنی گالم گلوچ اور مار دھاڑ پر اُتر آئے)۔‘‘
>
> ان نشانیوں کو سامنے رکھیے اور اپنے معاشرے کا جائزہ لیجیے۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہمارے ہاں جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی بڑا جھوٹا ہے‘ اتنا ہی بڑا وعدہ خلاف ہے۔‘‘(۱)

نفاق کی یہ علامات پوری قوم میں ہیں اور پھر اِس کی کریم اوپر آ کر حکمران بن جاتی ہے —— حکمران تو معاشرے کے عکاس ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **((کَمَا تَکُوْنُوْنَ کَذٰلِكَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ))** (۲) ’’جیسے تم خود ہو گے ویسے ہی لوگ تمہارے اوپر حکمران ہو جائیں گے!‘‘ لہٰذا صرف ایک طبقے کو موردِ الزام ٹھہرانا‘ یقیناً حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

ہم سب مجرم ہیں!

ہم سب کو اِس سوال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ۶۴ سالوں میں کیا ملک کا کوئی ایک طبقہ بھی ایسا ہے جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ اس کا کردار شاندار رہا‘ لہٰذا باقی اس کی تقلید کریں۔ اگرچہ ہر طبقے میں نیک لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ ہر طبقے میں آپ کو اِکا دُکا‘ ہزار میں ایک دو ایسے افراد مل جائیں گے‘ لیکن بات تو اکثریت کی ہو رہی ہے کہ مجموعی طور پر لوگوں یا طبقات کا کیا کردار ہے۔ سرمایہ دار طبقہ‘ دینی طبقہ‘ عدلیہ‘ سیاست دان‘ بیوروکریسی (چاہے سول ہو یا ملٹری کی)‘ وکلاء‘ صحافی‘ دانشور (دانشور تو اسلام کی جڑیں کھودتے ہیں) الغرض کوئی ایک طبقہ مجھے بتا دیجیے جس نے اپنا کردار صحیح معنوں میں ادا کیا ہو۔ آپ غور کریں تو آپ کا ذہن اس کا جواب نفی میں دے گا۔ کسی بھی طبقہ نے اپنا

---

(۱) توبہ کی عظمت اور اس کی تاثیر: ڈاکٹر اسرار احمد‘ ص ۵۴۔۵۵۔

(۲) رواہ البیھقی فی شعب الایمان‘ بحوالہ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب الامارۃ والقضاء‘ الفصل الثالث

کردار ادا نہیں کیا۔ پس یہ بدترین حالات ہمارے اجتماعی جرائم کی سزا ہے۔ موجودہ صورتِ حال کی ذمہ داری بحیثیت مجموعی تمام طبقات پر ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف!

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی طبقے کا جرم زیادہ ہے اور کسی کا کم۔ اس حوالے سے عوام الناس بالکل آخر میں آئیں گے‘ اس لیے کہ ان کو صحیح گائیڈ کیا ہی نہیں گیا۔ ان کی صحیح دینی رہنمائی نہیں کی گئی‘ اُن تک قرآن کا پیغام نہیں پہنچایا گیا‘ خود علماء نے انہیں کردار و عمل کی ایک روشن مثال بن کر نہیں دکھایا کہ مسلمان ایسا ہوتا ہے‘ الا ماشاء اللہ۔ یہاں بھی اچھے لوگ موجود ہیں‘ لیکن بحیثیت مجموعی اپنی دینی ذمہ داریوں سے غفلت کا چلن عام ہے۔

اب آیئے قرآن حکیم سے رہنمائی لیں۔ آج ہمیں جس بدحالی کا سامنا ہے اس کے لیے رہنمائی ہمیں سورۃ النحل کی آیت ۱۱۲ سے ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال بیان کی جو ہر طرح سے خوشحال تھی‘ لیکن جب اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی تو اس پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط کر دیا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿١١٢﴾ (النحل)

’’اور بیان کی اللہ تعالیٰ نے مثال ایک بستی کی‘ جس کے باشندے امن و سکون کے ساتھ رہ رہے تھے‘ چلا آتا تھا رزق اس کی طرف ہر جگہ سے‘ پھر انہوں نے اللہ کی ان نعمتوں کی ناقدری کی تو اللہ نے اس بستی کو چکھائے (دو عذاب) بھوک اور خوف‘ یہ سب لوگوں کے اپنے کرتوتوں کا انجام تھا۔‘‘

آج یہی دو عذاب ہمارے ملک پر مسلّط ہیں۔ بھوک اور غربت و افلاس کے ہاتھوں لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں۔ عوام کا ایک بہت بڑا طبقہ تیزی سے غربت کی لکیر سے نیچے جا رہا ہے۔ مہنگائی اپنی انتہا کو چھو رہی ہے‘ روزگار نہ ہونے کے برابر ہے۔ بیروزگاری کی اصل ذمہ دار حکومت ہے کہ اس نے روزگار کے مواقع پیدا ہی نہیں کیے۔ بے روزگاری کے نتیجے میں جرائم بھی بڑھیں گے اور کرپشن میں بھی اضافہ ہوگا۔ پھر اندرونی اور بیرونی دہشت گردی اور تخریب کاری کے خطرات ہر وقت سائے کی طرح ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ ایک طرف امریکہ اور نیٹو ہماری

مغربی سرحد پر کھڑے ہیں تو دوسری طرف بھارت دانت تیز کر رہا ہے‘ بقول والد محترم: ’’ہمارے دونوں طرف گِدھ بیٹھے ہوئے ہیں‘‘۔ ملک کے اندر خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ذوالفقار مرزا کے بیانات آنے سے پہلے‘ کراچی کے حوالے سے سارا پلان تیار ہو چکا تھا‘ ساری منصوبہ بندی مکمل ہو چکی تھی اور کراچی میں موجود تین متحارب قوتوں کا باقاعدہ تصادم شروع ہو چکا تھا‘ جس سے فائدہ اٹھا کر اقوامِ متحدہ کو مداخلت کرنی تھی۔ ملک میں خانہ جنگی کے خاتمے کی آڑ میں نیٹو فورسز بھی یہاں آ جاتیں‘ ادھر سے بھارت آ جاتا —— آیت کے آخر میں یہ واضح فرما دیا کہ یہ سب لوگوں کے اپنے کرتوتوں کا انجام تھا۔ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ پہلے مہربان تھا اب نامہربان ہو گیا۔ ہماری یہ حالت بھی ہمارے اپنے جرائم کا نتیجہ ہے۔

ذلّت و مسکنت کا عذاب کیوں؟

قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے بارے میں دو مقامات پر یہ مضمون آیا ہے کہ اُن پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾

’’اور ذلت (و رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اس کے) نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔‘‘

سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾

’’یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت کو دیکھو گے کہ ان سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ اللہ اور لوگوں کی پناہ میں آ جائیں اور یہ لوگ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اس

کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے۔ یہ اس لیے کہ یہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔“

مسکنت محتاجی کو کہتے ہیں۔ یہ ایسی حالت ہے جس میں ایک انسان خود اپنے بل پر کھڑا نہیں ہوسکتا‘ وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے۔ دیکھنے میں ٹھیک لگتا ہے‘ مگر اُس میں سکت نہیں ہوتی۔ جیسے آج ہم امریکہ بلکہ انڈیا کے خلاف کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنی ایک بے گناہ بیٹی عافیہ صدیقی کو جو شدید ترین عذاب سے گزر رہی ہے‘ امریکہ کے چنگل سے نجات دلا سکیں۔ یہ ہماری بے بسی اور لاچاری کا عالَم ہے۔ ہم سے یہ بھی نہ ہوا کہ ایک مردود امریکی غنڈہ جو ہمارے قابو میں آیا تھا‘ اس کے بدلے ہی عافیہ صدیقی کو چھڑوا لیتے۔ اسے کہتے ہیں مسکنت۔ ایک تو ہماری ذلت و رسوائی سارے عالم میں ہو رہی ہے۔ دوسرے بے چارگی اور بے بسی کا یہ عالم کہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔ یہ عذاب کل بنی اسرائیل پر آیا تھا‘ اور آج ہم اِس کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔

بنی اسرائیل کون ہیں؟ یہ سابقہ اُمتِ مسلمہ ہے۔ قرآن مجید میں ان کا بار بار ذکر عبرت پذیری کے لیے آتا ہے۔ قرآن بنیادی طور پر ہدایت اور رہنمائی ہے‘ یہ تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔ اس میں تاریخ کے واقعات کا تذکرہ بھی ہدایت کے پہلو سے ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل ہم سے پہلے اس زمین پر اللہ کی نمائندہ اُمت تھے۔ اللہ نے انہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چودہ سو برس اُس اُمت میں نبوت کا تار نہیں ٹوٹا۔ اُن کی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں جو نبی اور رسول سے خالی ہو۔ جب بھی ایک نبی کا انتقال ہوتا تو اُس کی جگہ لینے کو دوسرا آ موجود ہوتا‘ بلکہ کبھی ایک وقت میں دو دو نبی بھی ہوئے ہیں۔ بنی اسرائیل کو کئی کتابیں اور بے شمار صحیفے عطا ہوئے۔ انہیں جو فضیلت حاصل تھی اُس میں کوئی اُن کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اُن پر ذلت و مسکنت کا عذاب مسلط کر دیا گیا؟ قرآن نے اس کا سبب بھی بتا دیا‘ تاکہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں اور اپنے لیے راہ عمل کا تعین کر سکیں۔ تاریخ میں ان کی پیٹھ پر بار بار عذاب کے کوڑے برستے رہے۔ دو مرتبہ تو ان کا قبلہ بھی مسمار کیا گیا‘ اور وہ سینکڑوں برس ان کے ہاتھوں سے نکلا رہا۔

تقریباً ساڑھے چھ سو قبل مسیح میں بخت نصر نے فلسطینی ریاست پر حملہ کیا تھا۔ اس نے لاکھوں یہودیوں کو قتل کیا اور باقی تقریباً چھ لاکھ جن میں ان کے نبی بھی تھے‘ کو اپنے ساتھ قیدی بنا کر لے گیا۔ بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ معلوم ہوا کہ جب اللہ کی نمائندہ اُمّت بحیثیت مجموعی اللہ کے دین سے غداری اور بے وفائی پر اتر آئے تو پھر اس پر اللہ کی طرف سے ذلّت و مسکنت کا عذاب مسلّط ہو جاتا ہے۔ تقریباً دو ہزار برس تک بنی اسرائیل اس زمین پر اللہ کی نمائندہ امت رہے۔ ان کی تاریخ کا آغاز چودہ سو سال قبل مسیح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوتا ہے اور پھر ان کے بعد نئی اُمت کی تشکیل ۶۰۰ بعد مسیح میں ہوئی ہے۔ بنی اسرائیل نے دو ہزار سال تک اس زمین میں اللہ کی نمائندگی کی‘ جبکہ ساڑھے چودہ سو برس سے ہم مسلمان اس زمین پر اللہ کی نمائندہ امت ہیں۔ ہم نے اللہ کی نمائندہ (representative) اُمت ہو کر اس کے دن سے بے وفائی اور غداری کی‘ لہٰذا ذلت و مسکنت کا عذاب تو لازماً آنا تھا۔ دین سے بے وفائی کے سبب اُمتِ مسلمہ پر جو ذلت و رسوائی مسلّط ہے‘ اس کی انتہا وہ ہے جو آج پاکستان کے حصے میں آئی ہے کہ ایٹم بم پاس ہوتے ہوئے بھی ہم امریکہ کے آگے بچھے ہوئے ہیں۔ ہماری مثال اس آدمی کی سی ہے‘ جو دیکھنے میں بھلا چنگا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ کچھ کر نہیں سکتا—— پاکستان ہی نہیں پوری امتِ مسلمہ اس وقت ذلت و مسکنت کا شکار ہے۔ ہماری اس سے بڑھ کر ذلت کیا ہو سکتی ہے کہ امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا اور لاکھوں مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیے‘ اسی طرح عراق پر حملہ کر کے لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا‘ مگر ڈیڑھ ارب سے زائد آبادی پر مشتمل اُمتِ مسلمہ نے اس حوالے سے کوئی عملی قدم تو کجا‘ کوئی منصوبہ بندی تک نہیں کی کہ کیسے اس جارحیت کا راستہ روکا جائے اور کیسے کفر یہ جارح قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ امریکہ اور نیٹو ایک بھیڑ کو ذبح کرتے ہیں اور اگلی بھیڑ ذبح ہونے کا انتظار کرتی ہے۔ یہ ہے مسکنت!

یہ سب کیوں ہوا؟ اس کے اسباب وہی ہیں جو متذکرہ بالا آیات میں بنی اسرائیل کے جرائم کے ضمن میں موجود ہیں۔ بنی اسرائیل پر یہ عذاب کیوں آیا؟ ان پر ذلت و مسکنت کیوں تھوپ دی گئی؟ اس کے چار اسباب ہیں جو متذکرہ بالا دونوں مقامات پر آئے ہیں۔ ایک سبب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی‘ اللہ کے احکامات کو توڑا۔ اللہ نے انہیں شریعت عطا کی تھی تاکہ اس کے مطابق زندگی گزاریں‘ انہوں نے اُسے اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اللہ نے انہیں قانون دیا تھا کہ میری دھرتی پر میرا انظام قائم کرو‘ انہوں نے اسے پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا۔ مسکنت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ حد سے گزرنے والے تھے‘ سرکشی کرنے والے تھے۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ چوتھا سبب یہ تھا کہ بنی اسرائیل دین دشمنی میں اتنا آگے نکل گئے کہ انبیاء کو بھی قتل کرنے لگے۔ غور کیجیے‘ کیا یہی جرائم آج ہمارے نہیں

ہیں؟ ہم بھی اللہ کی نافرمانی کے راستے پر چل رہے ہیں۔

دین سے بے وفائی اور دنیا پرستی کے سبب دنیا میں ذلت ورسوائی سے دوچار ہونے کی تائید اس حدیث رسولؐ سے بھی ہوتی ہے جو حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ اقوامِ عالم تم پر ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جیسے دسترخوان پر (کھانا چننے کے بعد مہمانوں کو) کھانے کی دعوت دی جاتی ہے''۔ عربوں کی ضیافت اور مہمان داری کا طریقہ یہ تھا کہ سالم دنبہ یا بکرا' یہاں تک کہ پورا اونٹ روسٹ کر کے مہمانوں کے سامنے رکھ دیتے اور ان کو چھریاں پکڑاتے تھے کہ اپنا اپنا حصہ لیجیے' تناول فرمائیے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ ایک زمانے میں تمہاری حالت اس قدر کمزور ہوگی کہ اقوامِ عالَم تم پر ایک دوسرے کو دعوت دیں گی کہ آؤ اس میں سے اپنا اپنا حصہ لے لو۔ یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت پریشان ہوئے۔ ایک صحابی نے پوچھا: ''کیا ہماری تعداد کم ہو جائے گی؟'' یعنی کیا ہم اتنے کم ہوں گے کہ ساری اقوام ہمیں تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ کر جائیں گی۔ آپؐ نے فرمایا: ''(نہیں!) بلکہ تم اس دن تعداد میں بہت زیادہ ہوگے''۔ جیسا کہ آج دنیا میں ایک سو ساٹھ کروڑ مسلمان ہیں۔ ''لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے اوپر کے جھاگ کی سی ہوگی اور اللہ تعالیٰ دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال دے گا''۔ چنانچہ ایٹم بم رکھنے کے باوجود بھی وہ تمہارے ساتھ جو چاہیں گے سلوک کریں گے۔ ایسی بدترین صورتِ حال کیوں ہوگی' اس کی وجہ بھی حدیث کے آخر میں بیان فرما دی: ''اللہ تعالیٰ تمہارے اندر ایک بیماری ''وہن'' پیدا کر دے گا''۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا: ''وَھن'' کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''دُنیا کی محبت اور موت کا خوف۔''(۱)

ہمارا جرم عظیم: اللہ کے دین سے بے وفائی

متذکرہ بالا حدیث کے آخری جملے میں ہماری زبوں حالی کا اصل سبب بتا دیا گیا ہے اور وہ سبب ہے دنیا پرستی۔ دنیا میں مسلمان کی حیثیت اللہ کے نمائندے کی ہے۔ اُس کی زندگی کا واحد مشن یہ ہے کہ کل روئے ارضی پر اللہ کے دین کو قائم اور غالب کرے اور اس راہ میں اپنی تمام تر صلاحیتیں اور توانائیاں لگا دے' مگر آج مسلمان اپنا مشن بھول گئے ہیں۔ ہم ساری دنیا پر اللہ کے دین کو کیا غالب کریں گے' ہم تو اپنے اپنے ملکوں میں بھی شریعت کو نافذ نہیں کر سکے

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الملاحم' باب فی تداعی الامم علی الاسلام۔

بلکہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ ہم اپنے مشن اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو بھلا کر اللہ کے منکروں کی طرح دنیا ہی کے پجاری ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ ہے وہ جرم جس کی بنا پر کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود دنیا میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر　　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

یعنی ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں جبکہ ہمارے اسلاف حقیقی مسلمان تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مسلمان اللہ کی نمائندگی کے حامل ہیں' ہمیں ساری دُنیا کے لیے رول ماڈل بننا ہے اور غلبۂ اسلام کے نبوی مشن کو آگے بڑھانا ہے۔ عہد صحابہؓ اور بعد کی کئی صدیوں میں مسلمان یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ کسی خطے میں مسلمان اکثریت میں ہوں اور وہاں حکمران بھی مسلمان ہوں لیکن وہاں شریعت کا نفاذ نہ ہو۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مسلمان اللہ سے ایسی بغاوت بھی کر سکتا ہے کہ اُسے زمین پر قوت واختیار حاصل ہو اور وہ پھر بھی اس میں اللہ کے نظام کو نافذ نہ کرے۔ اُمتِ مسلمہ میں ہم مسلمانانِ پاکستان کا قصور تو اور بھی زیادہ ہے۔ ہم نے تو یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا' مگر پھر بھی یہاں پر شریعت نافذ نہ کر سکے۔ ہماری عدالتیں آج بھی ۱۹۳۵ء کے برٹش ایکٹ کے تحت چل رہی ہیں۔ شعر کے دوسرے مصرع ''اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!'' میں اقبال نے قرآن وسنت کی تعلیمات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ یعنی تمہارے تمام مسائل کا سارا حل قرآن مجید میں موجود ہے۔ جب تم نے قرآن کو چھوڑ دیا' اللہ کے دین کو ترک کر دیا اور قرآن کے ساتھ ساتھ صاحب قرآن حضرت محمد ﷺ سے بے وفائی کی تو پھر اللہ نے بھی تمہیں چھوڑ دیا۔ نتیجتاً تم دنیا میں ذلیل وخوار ہو گئے۔ اور جب تمہاری یہ حالت تمہارے ہی کرتوتوں کی سزا ہے تو پھر تمہارا یہ شکوہ بالکل بے جا ہے کہ ؎

رحمتیں ہیں تیری اغیار کے کاشانوں پر　　　برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

سب سے پہلے اسلام!

مسلمان دنیا کے کسی بھی خطے یا وطن میں رہتا ہو اس کا تشخص اور شناخت اسلام ہے۔ اگر وہ اپنی یہ شناخت کھو بیٹھے تو اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار ہو کر خودغرض اور مفاد پرست ہو جاتا ہے۔ پھر اپنے ہی وطن کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ کر کھا جاتا ہے۔ ہم اہلِ پاکستان دس سال سے جو نعرہ الاپ رہے ہیں کہ ''سب سے پہلے پاکستان'' اس نعرہ نے ہماری شناخت کے مسئلہ کو گھمبیر تر بنا دیا ہے۔ یہ نعرہ کسی طور پر بھی پاکستان کے حق میں نہیں ہے۔ یہ ہمارے اساسی نظریے ہی کے خلاف ہے' جس پر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ

اسلام قطعاً ہماری ترجیح نہیں ہے۔ ہمارا نعرہ تو ’’سب سے پہلے اسلام‘‘ ہے۔ یہی نعرہ اقبال نے لگایا تھا جب انہوں نے وطنی قومیت کو اس دور کا سب سے بڑا شرک قرار دیا تھا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور   ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور   تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے   غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے   اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے!

یہ ہیں وہ تلخ حقائق جو اللہ کے غضب کو بھڑکانے والے ہیں‘ مگر ہمیں ان کی ذرّہ بھر پروا نہیں ہے۔ ہم نے تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے اِسی لیے ’’توبہ کی پکار‘‘ کی مہم شروع کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ملک چونکہ اسلام کے نام پر وجود میں آیا‘ لہٰذا اس کا استحکام‘ اس کی بقا وسالمیت صرف اور صرف حقیقی اسلام سے وابستہ ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہمیں سچی توبہ کرنی ہوگی‘ اپنے عمل کی اصلاح کرنی ہوگی‘ جن جرائم کا ہم سے ارتکاب ہوا‘ ان کا ازالہ کرنا اور اُن پر سجدۂ سہو کرنا ہوگا۔ اس کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ ہمیں اپنی چارج شیٹ معلوم ہو کہ ہمارے جرائم کون سے ہیں۔ عوام سمجھتے ہیں ہمارا کوئی جرم نہیں ہے۔ دینی جماعتیں کہتی ہیں ہمارا کوئی جرم نہیں‘ سارا جرم حکمران طبقے کا ہے۔ سیکولر حضرات اور طبقات کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی جرم نہیں ہے‘ سارا جرم مولویوں کا ہے۔ تو جب تک جرائم کا احساس نہیں ہوگا توبہ کیسے ہوسکتی ہے۔

اللہ کے دین سے بے وفائی کے چند شواہد

دیکھئے‘ ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی ہم نے اللہ کے دین سے بے وفائی اور غداری کی ہے۔ اس حوالے سے کچھ اور شواہد میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اور ایک بیرومیٹر آپ کو دے رہا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ ہمارا دین سے صحیح معنوں میں تعلق کتنا ہے؟ کلمہ طیبہ کے بعد سب سے اہم شے نماز ہے‘ جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَلصَّلَاۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ))(۱) ’’نماز دین کا ستون ہے‘‘۔ یعنی دین کی عمارت جن ستونوں پر کھڑی ہے ان میں اہم ترین ستون نماز ہے۔ نماز کے بارے میں ایک روایت میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں: ((بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْکِ وَالْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ))(۲) ’’بندے اور کفرو شرک کے درمیان نماز کا معاملہ حائل ہے‘‘۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان کے مسلمانوں میں دس فیصد سے بھی کم لوگ پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر نوے فیصد سے زیادہ پاکستانی مسلمان ایسے ہیں جو نماز نہیں پڑھتے۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ کے مبارک دور میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ کوئی مسلمان ہو اور نماز نہ پڑھتا ہو۔ بدترین منافق بھی اپنے آپ کو مسلمانوں کی صف میں شامل کرنے کے لیے پنج وقتہ نماز پڑھتے تھے۔ معاشرتی سطح پر دیکھیں‘ تو ہماری رسومات‘ ہمارا کلچر‘ ہماری تہذیب‘ ہماری ثقافت سب غیر مسلموں کی ثقافت سے مشابہ ہے اور ہم غیر اسلامی ثقافت میں اور زیادہ ’’ترقی‘‘ کر رہے ہیں۔ اقبال نے اسی کا مرثیہ کہا تھا کہ۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

عوام کی اکثریت کی وضع وقطع عیسائیوں والی ہے‘ جن کی مشابہت اختیار کرنے سے رسول اللہ ﷺ سے منع فرمایا تھا۔ ہمارا تمدن ہندوانہ ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے شادی بیاہ کی رسومات ہی کافی ہیں۔ ہمیں یہ بات تو یاد ہے کہ ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ))(۳) مگر اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ شادی بیاہ کے ضمن میں اسلامی تعلیمات اور اقدار کا اہتمام کریں۔ ہماری شادی بیاہ کی رسومات ہندووانہ ہیں۔ پھر یہ کہ ہم نے فحاشی اور عریانی کے سیلاب کے لیے اپنے گھروں اور دلوں کے دروازے کھول رکھے ہیں‘ حالانکہ فحاشی اور برائی شیطان کا ہتھیار ہے‘ جس کے ذریعے وہ لوگوں پر حملہ کرتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ﴾ (البقرۃ:۱۶۹) ’’وہ (شیطان) تمہیں گناہوں اور فحاشی کا حکم دیتا ہے۔‘‘

یہ تو بحیثیت فرد ہمارے دین سے عملی تعلق کی چند مثالیں ہیں۔ اب ذرا اجتماعی حیثیت سے دیکھ لیجئے کہ ہم اللہ کے دین کے کتنے وفادار ہیں! اللہ سے وفاداری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے قانون اور دستور کو مسلمانوں کے معاشرہ میں قائم اور نافذ کیا جائے۔ اللہ کا

---

(۱) شعب الایمان للبیہقی ۱۰۷۷/۳۔ والجامع الصغیر للسیوطی‘ ح:۵۱۸۵۔
(۲) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ۔
(۳) سنن ابن ماجہ‘ کتاب النکاح‘ باب ما جاء فی فضل النکاح۔

قانون اس لیے نہیں ہے کہ اس کو لکھ کر عجائب گھر کی زینت بنا دیا جائے یا ایک نظریاتی کونسل بنا دی جائے جو غیر اسلامی قوانین اور خلافِ شریعت کاموں کے حوالے سے سفارشات تیار کرے اور پھر انہیں کباڑ خانے میں پھینک دیا جائے۔ ہمارے ہاں شریعت کے ساتھ یہ کھلا مذاق کئی دہائیوں سے ہو رہا ہے۔ ہمیں یہ احساس ہی نہیں کہ شریعت نافذ نہ کر کے ہم بحیثیت قوم اللہ کی نگاہ میں کتنے بڑے مجرم بن چکے ہیں۔ ہماری ترجیحات یہ ہیں کہ مہنگائی نہیں بڑھنی چاہیے' لوڈشیڈنگ نہیں ہونی چاہیے' ہماری تفریح کے سامان میں کمی نہیں آنی چاہیے۔ باقی رہی شریعت کی بات تو وہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے جو بات سامنے آتی ہے' وہ یہ ہے کہ جس ملک میں مسلمان اکثریت میں ہوں' وہاں حکمران بھی مسلمان ہوں مگر پھر بھی وہاں شریعت کا نفاذ نہ ہو' اور نہ ہی لوگ اس کے لیے جِدّوجُہد کر رہے ہوں تو یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ سے کھلی بغاوت کے مترادف ہے۔ اس بات کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھ لیجیے۔ قرآن کریم میں جابجا اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ زمین کسی کی جاگیر نہیں ہے' اس کا خالق و مالک اللہ عزوجل ہے۔ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اللہ نے اُسے اپنا قانون' اپنا دستور اور شریعت کا پورا ڈھانچہ اس لیے دیا ہے کہ وہ اُس کی زمین پر اُس کے قانون و شریعت کو نافذ کرے۔ لیکن ہم نے اللہ کے اس نظام کو ٹھوکر مار کر شیطانی نظام رائج کیا ہوا ہے' اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ پروردگار! ٹھیک ہے تو نے ہمیں یہ قانونِ شریعت دیا ہے' لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس پہلو سے ہم مسلمانانِ پاکستان سب سے بڑے مجرم ہیں۔ ہمارا جرم دوہرا ہے۔ اس لیے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے۔ لیکن ہم نے ۶۴ سال میں دین اسلام کے نفاذ کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

اسلامی عائلی قوانین کے معاملے میں ہندوستانی مسلمانوں کی حسّاسیّت

اسلام کے حوالے سے ہماری محرومی کا یہ عالم ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک کے باشندوں کو اتنا اسلام بھی میسّر نہیں ہے جتنا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس وقت بھی میسّر ہے۔ والد محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ اس بارے میں فرماتے تھے:

> ''میں واقعتاً ہندوستان کے مسلمانوں کو خراجِ تحسین پیش کرتا رہا ہوں اور آج پھر کرتا ہوں کہ انہوں نے اسلامی عائلی قوانین کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ وہاں ذرا سا ایک معاملہ پیش آیا تھا اور وہ بھی اسلامی قوانین کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی گئی تھی' بلکہ کلکتہ ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ آ گیا تھا جس کا اثر اسلامی عائلی قوانین پر پڑ رہا تھا☆۔ اس پر ہندوستان کے مسلمانوں کا اس قدر شدید ردّعمل ہوا تھا کہ راجیو گاندھی کی گورنمنٹ کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور سپریم کورٹ کو یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔ وہاں تمام مسلمان اس معاملہ میں جس طرح متحد ہوئے' اس کی ایک مثال بھی پاکستان میں نہیں ملتی۔ ہم تو شریعت بل اور شریعت محاذ میں بھی اس طرح جمع نہیں ہو سکے تھے۔ وہاں پر شیعہ' سنی' بریلوی' دیوبندی' اہلحدیث' جماعت اسلامی اور سب مسلمان ایک پلیٹ فارم (مسلم پرسنل لاء بورڈ) پر بلاتفریق جمع ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے بتایا گیا کہ جب سے وہاں پرسنل لاء بورڈ قائم ہوا' اس کے بعد سے ہندوستان کے مسلمان اس طرح ''بنیانِ مرصوص'' بن گئے ہیں کہ کہیں شیعہ سنی فساد بھی نہیں ہوا' حالانکہ اس سے پہلے کوئی ماہِ محرم ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں کوئی فساد نہ ہوا ہو۔ میں یقیناً انہیں سلام کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی صحیح بیداری کا ثبوت دیا ہے کہ ہماری یہ چاردیواری ہی تو باقی رہ گئی ہے' اس کے اندر اسلامی معاشرت کے تحفظ کا ابھی ہمارے پاس ایک ذریعہ موجود ہے۔ کہیں اگر یہ چاردیواری منہدم ہو گئی تو پھر ہمارا تشخص ختم ہو کر رہ جائے گا۔''

جن دنوں انڈیا میں عائلی قوانین کے تحفظ کی تحریک چل رہی تھی اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے' اِن دنوں انہوں نے یہ بات کہی تھی جو ہم سب کے لیے بھی لمحۂ فکر یہ ہے:

> ''اے مسلمانو! اگر تم سے تمہارے عائلی قوانین چھین لیے گئے' تمہارے فیملی لاز کے اندر مداخلت ہوئی اور تم غیر اسلامی قانون کے پیچھے چلو گے تو تم مسجد میں مسلمان ہو گے اور اپنے گھر میں کافر ہو گے۔''

یہ الفاظ اُس محترم شخصیت اور بہت بڑے عالمِ دین کے ہیں جن کے علم کا لوہا برصغیر پاک و ہند ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام اور بالخصوص عرب دنیا میں مانا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان تحسین کے لائق ہیں کہ انہوں نے اپنے عائلی قوانین میں ذرا بھی مداخلت برداشت نہیں کی' جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ملک میں عرصہ دراز سے غیر اسلامی عائلی قوانین نافذ چلے آ رہے

☆ کلکتہ ہائی کورٹ نے شاہ بانو کیس میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ کوئی مسلمان اگر اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور وہ مطلقہ دوسری شادی نہ کرے تو جب تک وہ زندہ رہے گی اس کا نان نفقہ طلاق دینے والے کے ذمّے رہے گا۔ اس پر بھارت کے مسلمانوں نے کہا کہ یہ ہماری شریعت اور عائلی قوانین میں دخل اندازی ہے' کیونکہ شریعت نے مطلقہ کے لیے صرف عدت تک نان ونفقہ کا حق رکھا ہے۔ (مرتب)

ہیں اور ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہمارے ہاں ۱۹۶۲ء میں جو عائلی قوانین نافذ کیے گئے اُن کا مرتّب کرنے والا اس دور کا سب سے بڑا منکرِ حدیث وسُنّت غلام احمد پرویز تھا۔ اس کے مرتّب کردہ قوانین کو ملک کے تمام دینی مکاتبِ فکر نے سو فیصد قرآن وسنت کے خلاف قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ہمیں منظور نہیں ہیں' اس لیے کہ یہ اسلام کے عائلی قوانین نہیں ہیں۔ لیکن آج تک وہی اس ملک میں چلے آتے ہیں۔ لیکن کہیں کوئی ارتعاش نہیں ہے —— اسی طرح ہمارا معاشی نظام پورے کا پورا سود پر مبنی ہے۔ ملکی معیشت سو فیصد سود پر چل رہی ہے' حالانکہ سود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم سود سے باز نہیں آتے تو اللہ اور رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ پرویز مشرف کے دور میں ہماری اسمبلی نے ''تحفظ حقوقِ نسواں'' بِل پاس کیا' جس کے بارے میں پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کے سو فیصد علماء متفق ہیں کہ یہ قرآن وسنت سے بغاوت ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سراسر غیر اسلامی قانون اس اسمبلی نے منظور کیا جس کا حصہ ہماری دینی جماعتوں کا اتحاد متحدہ مجلسِ عمل (ایم ایم اے) بھی تھی۔ رواں سال اسلام سے انحراف کی تازہ مثال ہمارے سامنے آئی ہے جس نے ہماری دستوری منافقت کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ سلمان تاثیر قتل کے فیصلے میں جج نے ممتاز قادری سے کہا: ''اسلام کی رو سے تم نے ٹھیک کیا' مگر پاکستان کے قانون کی رو سے میں تمہیں دوہری سزائے موت دیتا ہوں'' —— ہمیں اِس وعید کا کوئی احساس ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ نے قانونِ شریعت کی بجائے غیر اسلامی قانون کے نفاذ کے حوالے سے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح فیصلہ ہے جو سورۃ المائدہ میں سنایا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (٤٤)
وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (٤٥)
وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (٤٧)

ان آیاتِ قرآنیہ کو سامنے رکھیے اور ملتِ اسلامیہ کی موجودہ کیفیت کا جائزہ لیجیے کہ دنیا میں کتنے ممالک ہیں جہاں اللہ کا قانون نافذ ہے؟ آج روئے زمین پر کوئی ایک بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں شریعت اور اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی پورے طور پر قائم ہو۔ ہم انفرادی زندگی میں تو مسلمان ہیں لیکن ہم پر جو نظام مسلّط ہیں' وہ کافرانہ ہیں۔

افغانستان کے حوالے سے بھی ہم مجرم ہیں

ہم پاکستانی مسلمانوں کا دوسرا بڑا جرم نظامِ شریعت کے خاتمے میں تعاون کرنا ہے۔

افغانستان میں صحیح معنی میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوا' اور اس کی برکات بھی سامنے آنے لگی تھیں۔ طالبان کے دورِ اقتدار میں مجھے دو مرتبہ افغانستان جانے کا موقع ملا۔ اسلامی نظام کے سبب وہاں مکمل امن وامان ہو گیا تھا اور جرائم سے پاک سوسائٹی وجود میں آ گئی تھی۔ جلال آباد کی جیل کے پاس سے گزرتے ہوئے میرے میزبان نے مجھے بتایا کہ یہ تین صوبوں کی مشترکہ جیل ہے۔ اس پر بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ پھر تو جیل میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہو گی۔ لیکن اُس کے جواب نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ اُس نے کہا: نہیں' بلکہ اس میں اس وقت صرف تین قیدی ہیں —— حقیقت تو یہ ہے کہ طالبان افغانستان نے اسلامی شریعت نافذ کر کے اس عالمِ ارضی پر شریعتِ مطہرہ کا ایک نمونہ پیش کر دیا تھا' جس کے نتیجے میں ایسے ایسے معجزات رونما ہوئے کہ پوری دنیا حیران رہ گئی۔ ہم پاکستانیوں نے نوزائیدہ امارتِ اسلامی افغانستان کے حوالے سے مجرمانہ کردار ادا کیا۔ ہم نے وقت کی واحد اسلامی حکومت کو ختم کرنے میں صلیبی' طاغوتی اور ابلیسی قوتوں کا ساتھ دیا جو اللہ اور رسول ﷺ کے سب سے بڑے دشمن اور سب سے بڑے باغی ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی جرم ہو سکتا ہے' جو ہم نے کیا!

یہ اور بات ہے کہ طالبان کی استقامت' جان فروشی اور اللہ پر توکّل کے نتیجے میں آج امریکہ کو بدترین شکست کا سامنا ہے۔ وہ طالبان سے مذاکرات کی بھیک مانگ رہا ہے' تاکہ طالبان کے شکنجے سے رہائی پائے' جبکہ دوسری طرف ایٹمی طاقت کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں ذلت ورسوائی اور امریکی جارحیت کا سامنا ہے' جس کا نمایاں مظہر ایبٹ آباد آپریشن ہے۔ سانحہ ایبٹ آباد ایک پراسرار راز بن گیا ہے' اس معنی میں کہ صدام کے فوٹو آ گئے' قذافی کے فوٹو آ گئے' لیکن اسامہ کے حوالے سے امریکہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم اس کے فوٹو شائع نہیں کریں گے اور کوئی ثبوت بھی نہیں دیں گے' بس ''غیب'' پر ایمان رکھو۔ پچھلے دنوں امریکہ سے ہمارے ایک دوست آئے۔ وہ کہنے لگے کہ سانحۂ ایبٹ آباد کے بعد ہم پاکستانیوں کے لیے گھروں سے باہر نکلنا بھی محال ہو گیا ہے۔ وہاں کے یہود ونصاریٰ تو پہلے بھی ہمیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے' لیکن اب مقامی مسلمان بھی ہمیں نفرت سے دیکھتے ہیں۔ مقامِ غور ہے کہ یہ ملک کس ذلّت اور پستی میں چلا گیا ہے!

مسائل کا حل: خالص اجتماعی توبہ

اب ہم آخری بحث کی طرف آتے ہیں۔ یعنی ہماری زبوں حالی اور پستی کا علاج کیا ہے؟ ہماری پستی کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم ان تمام جرائم کا ازالہ کریں جن کی وجہ سے آج ہم

ذلت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار ہیں۔ متذکرہ تمام جرائم سے ہمیں صحیح معنوں میں تائب ہونا ہوگا۔ سچی توبہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم ایک بہت بڑا یوٹرن لیں۔ اس وقت ہم پر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سو فیصد صادق آتا ہے: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْھَمِ))⁽¹⁾ ''ہلاک اور برباد ہو جائے درہم و دینار کا بندہ''۔ ہم اللہ کے بندے بننے کی بجائے درہم و دینار اور مفادات اور مصلحتوں کے بندے بن کر ہلاکت کے گڑھے میں گر چکے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے اپنا قبلہ سیدھا کرنا ہوگا اور اس کا پہلا قدم سچی توبہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ؕ﴾ (التحریم:۸)

''اے اہلِ ایمان! اللہ کی جناب میں توبہ کرو، خالص توبہ۔''

اگرچہ ہماری قوم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو!

لیکن یہ خال خال ہیں، جبکہ ذلت و مسکنت کے اس عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے ضروری ہے کہ قوم کا ایک قابلِ ذکر حصہ توبہ کرے اور اپنا قبلہ درست کرے، تب ہی اللہ کی مدد آئے گی اور پاکستان کے مسائل بھی حل ہوں گے۔ معاشرے کے کم از کم ۲۵ فیصد لوگ تو سچی توبہ کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر لیں۔ اصلاحِ عمل توبہ کا لازمی تقاضا ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں شرک، قتلِ ناحق اور زنا جیسے کبیرہ گناہوں کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۷۰﴾﴾ (الفرقان)

''سوائے اس کے جو تائب ہوا اور ایمان لایا اور اچھے عمل کیے (تو یہ وہ لوگ ہیں کہ) اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا، رحم کرنے والا۔''

اس آیت میں سچی توبہ کی تین شرائط کا ذکر ہے کہ جن سے 'توبہ' توبہ بنتی ہے۔ سب سے پہلا یہ ہے کہ انسان اعترافِ جرم کرے اور پشیمانی اور ندامت کے جذبات سے اللہ کے آگے گڑگڑائے اور استغفار کرے۔ علامہ اقبال کا بہت پیارا شعر ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے!

سچی توبہ کی دوسری شرط جو اس آیت میں بیان ہوئی وہ ''اٰمَنَ'' ہے۔ یعنی تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ عہد ہو کہ آئندہ ان جرائم کا ارتکاب نہیں کروں گا اور اللہ کا سچا اور وفادار بنوں گا۔ تیسری شرط

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب الحراسۃ فی الغزو فی سبیل اللّٰہ۔

ہے: ﴿وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ یعنی عمل کی اصلاح کی جائے اور گناہ کو ترک کر دیا جائے۔ یہی قبلہ کی درستی اور اصلاحِ عمل کا نقطہ آغاز ہے۔ اب عمل کی طرف کس طور سے بڑھنا ہے اس کے لیے سورۃ البقرۃ کی یہ آیت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ﴾

''اے اہلِ ایمان! دین اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہی ہماری زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہونا چاہیے۔ انفرادی زندگی کی اقدار ہوں یا اجتماعی ضوابط، معاشرت ہو یا معیشت، اخلاقیات ہو یا سیاست، حقوق العباد ہوں یا حقوق اللہ، ہر جگہ اللہ کے حکم کی کارفرمائی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ احکامِ شریعت جیسے نماز، روزہ میں تو شریعت کی پیروی ہو، مگر سود کی آلائش سے اپنے آپ کو بچانے کا کوئی اہتمام نہ ہو، کہ اس کے بغیر تو گزارا ممکن نہیں۔ اِسی طرح ستر و حجاب کے احکامات کو دورِ حاضر کے تقاضوں کے منافی قرار دے کر مسترد کر دیا جائے۔ اگر طرزِ عمل یہ ہے تو یہ ہرگز اسلام کی پیروی نہیں ہے، یہ نفس کی پیروی ہے، یہ یہودیوں کا طرزِ عمل تھا، جس پر قرآن حکیم نے سخت وعید سنائی ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ﴾ (البقرۃ:۸۵)

''تو کیا تم کتاب (الٰہی) کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔ تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں اُن کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیے جائیں۔''

اصلاحِ معاشرہ ہماری ذمہ داری ہے

پورے دین میں داخل ہونے کا پہلا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کی حد تک تو پورے مسلمان بنیں۔ لیکن یہی بات کافی نہیں کہ آدمی اپنی ذات کی حد تک دین کا پیرو ہو، بلکہ دین کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ معاشرتی اصلاح کی جدّوجہد کی جائے، معروفات کے فروغ اور منکرات کے خاتمہ کی سعی کی جائے۔ آج کل ہمیں رواداری اور برداشت کا جو سبق پڑھایا جا رہا ہے کہ

دوسرا جو چاہے کرے تم اس کے معاملے میں دخل نہ دو‘ یہ اسلامی زندگی سے کھلم کھلا انحراف ہے۔ ہمارا دین یہ بتاتا ہے کہ جو شخص دوسرے کو برائی سے نہیں روکتا وہ گونگا شیطان ہے۔ برائی سے نفرت اور اُس کے خاتمے کی سعی و کوشش تو ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ‘ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ‘ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ‘ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱)

’’تم میں سے جو کوئی بھی کسی منکر کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے بدلے۔ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (یعنی تلقین و نصیحت سے اس بُرائی کو روکے)۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اس کے خلاف نفرت کا اظہار کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔‘‘

نہی عن المنکر کے تعلق سے مسلمان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ انہیں قوتِ بازو سے بدل دے‘ اُن کا خاتمہ کرے‘ لیکن اُس کے لیے بھی ہمیں طریق سیرتِ مطہرہ سے لینا ہوگا۔ اس کے لیے پہلے قوت مجتمع کرنی ہوگی۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قربانیاں دے کر‘ اپنا جان و مال کھپا کر منکرات کا خاتمہ اور دین کو غالب اور قائم کیا۔

اسلام میں پورے داخلے کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ﴾ (الصف: ۱۴) ’’اے اہلِ ایمان‘ اللہ کے مددگار بن جاؤ‘‘۔ یہ دین پوری نوعِ انسانی کے لیے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو اس مشن کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ آپؐ دین حق کو غالب فرمائیں: ﴿وَھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾ (التوبۃ: ۳۳‘ الفتح: ۲۸‘ الصف: ۹) ’’اور وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا‘ تاکہ وہ اس دین کو کُل نظامِ اطاعت پر غالب کر دے‘‘۔ آپ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اپنے مشن کو بتمام و کمال پورا فرما دیا۔ اب اُمتِ محمدیہ ہونے کے ناتے یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس مشن کو آگے بڑھائیں۔ یہ عمل اللہ کی نصرت ہے۔ اللہ کی زمین پر غاصبوں‘ باغیوں اور سرکشوں کا نظامِ چل رہا ہے‘ یہاں پر شیطان کی عمل داری ہے۔ اب جو شخص بھی روئے زمین سے شیاطین کے نظام کو ہٹانے کے لیے کام کر رہا ہے‘ وہ اللہ کا مددگار ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان......

یہ بات واضح ہو کہ یہ کام فرد اکیلا انجام نہیں دے سکتا‘ اس کے لیے اسے کسی ایسی اجتماعیت سے جڑنا ہوگا جو غلبہ و نفاذِ شریعت کے لیے قائم ہوئی ہو اور اپنے جسم و جان کی توانائیاں اور مال کا ایک حصہ لگانا ہوگا۔ اور اللہ کی نصرت و مدد بھی تب آئے گی جب ہم یہ کام کریں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ﴾ (الحج: ۴۰) ’’اور اللہ ان کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کریں گے‘‘ —— اس حوالے سے ایک اور آیت سورۂ محمد میں ہے۔ وہاں خطاب براہِ راست مسلمانوں سے ہے۔ فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ⑦﴾

’’اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے پاؤں جما دے گا۔‘‘

آج ہمارا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ نے ہمیں دبایا ہوا ہے۔ ہم نے شروع دن سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ امریکہ بڑی قوت ہے‘ ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے‘ لہٰذا اس کے آگے بچھ گئے۔ اب امریکہ کے مقابلے کے لیے ہمیں اس سے بڑی قوت کا سہارا چاہیے‘ اور وہ اللہ جل شانہ کی ذات ہے جو پوری کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ امریکہ تو سول سپریم پاور آن ارتھ ہے‘ جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سول سپریم پاور آن یونیورس ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھیے کہ امریکہ کی قوت اپنے بل پر نہیں ہے بلکہ یہ قوت اُسے اللہ نے دی ہے اور اللہ جب چاہے اُسے سلب کر لے۔ یہ ہم پر اس لیے مسلط ہے کہ ہم نے اللہ کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ ہم سے پہلے بنی اسرائیل پر بھی دین سے بے وفائی کے سبب عذاب آیا تھا تو وقت کے نمرود و فرعون مسلط ہوتے رہے۔ جیسا کہ عراق کے بادشاہ بخت نصر نے ارض فلسطین پر حملہ کیا اور یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ قرآن حکیم اس بارے میں کہتا ہے: ﴿بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ﴾ (الاسراء: ۵) ’’پھر ہم نے تم (یعنی بنی اسرائیل) پر اپنے ایسے بندے مسلط کر دیے جو بڑے جنگجو تھے‘‘۔ آج کا فرعون اور نمرود امریکہ بھی ہم پر اس لیے مسلط ہے کہ ہم اللہ کے دین سے غداری کر رہے ہیں۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اس غداری سے باز آ جائیں۔ یقین کیجیے اگر ہم اللہ کے دین کا دامن تھام لیں تو اللہ کی نصرت کے سہارے امریکہ تو کیا سارے عالمِ کفر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کیا طالبانِ افغانستان کی شاندار مزاحمت سے یہ

بات ثابت نہیں ہوگئی ہے؟ مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا پختہ یقین ہونا چاہیے کہ اگر اللہ ہمارا ساتھ دے تو کوئی ہم پر فتح حاصل نہیں کرسکتا۔ ہاں‘ اگر اللہ ہی ہمارا ساتھ چھوڑ دے تو پھر دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی ہمیں سہارا نہیں دے سکتیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۶۰﴾ (آل عمران)

”(اے مسلمانو!) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکے گا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے (یعنی تمہاری مدد سے دست کش ہو جائے) تو پھر ایسا کون ہے جو تمہاری مدد کرسکے گا اس کے بعد؟ اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔“

ظاہر ہے کہ جب ہم اللہ کی مدد کررہے ہوں‘ اللہ سے وفاداری کررہے ہوں‘ اُس کے دین کے لیے قربانیاں دے رہے ہوں‘ ہم نے اس مشن کو اپنایا ہو‘ جو محمد رسول اللہ ﷺ کا مشن تھا‘ تو پھر اللہ تعالیٰ کی مدد یقیناً آئے گی اور جب اللہ کی مدد آئے گی تو کوئی قوت بھی ہم پر غالب نہیں آسکتی۔

نفاذِ شریعت کے دُنیوی فوائد

اگر ہم واقعتاً سچی توبہ کرکے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بن جائیں‘ اُس کے دین کے عملی تقاضوں کو پورا کریں، شریعت کو زمین پر نافذ کردیں تو اس کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں اللہ کی مدد حاصل ہوجائے گی۔ اس حوالے سے طالبان کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ان کے پاس کون سی ”ٹیکنالوجی“ ہے جس کی وجہ سے دُنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت امریکہ اور نیٹو کو اُن کے مقابلے میں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ دُنیوی وسائل اور جدید اسلحہ کے لحاظ سے طالبان حکومت دنیا کی کمزور ترین حکومت تھی۔ طالبان نے بے حد کٹھن مراحل سے گزر کر شریعت نافذ کی اور جب شریعت قائم ہوگئی تو ان پر ہر طرف سے پابندیاں لگادی گئیں اور امداد بند کردی گئی۔ دوسری طرف حملہ آور امریکہ اور اُس کے اتحادی اتنے طاقتور اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں کہ اُن سے طالبان کا موازنہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ پھر یہ کہ مٹھی بھر طالبان کو افغانستان کے بھی سارے عوام کی پشت پناہی حاصل نہیں تھی۔ اور اس پر مستزاد ہم پاکستانیوں نے اپنے اسلامی بھائیوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے میں امریکہ کا ساتھ دیا۔ اس اعتبار سے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تاریخ انسانی میں حق و باطل کے معرکے تو بہت ہوئے اور قرآن حکیم کے الفاظ میں کئی بار ایسا ہوا کہ اللہ کے حکم سے ایک چھوٹا گروہ بڑے گروہ کے اوپر

حاوی ہوگیا‘ لیکن عسکری طاقت اور افرادی قوت کا اتنا عدم توازن اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس تمام تر طاقت اور رعونت کے باوجود عالم کفر اور امریکہ افغانستان سے ذلیل ہوکر نکل رہا ہے؟ کیا تاریخ کے اس محیر العقول واقعہ میں ہمارے لیے کوئی سبق اور راہنمائی نہیں ہے؟ کیا نفاذِ شریعت کے لیے ہمیں اس سے بھی بڑا معجزہ چاہیے! طالبان نے یہ معجزہ اس یقین کی بنا پر کر دکھایا کہ ﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ﴾ ”اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی قوت تم پر غالب نہیں آسکتی۔“ ہمیں بھی اپنے اندر یہ یقین پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرے نفاذ شریعت کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے برکات آئیں گی۔ وہ برکات کیا ہیں؟ اِن کا تذکرہ سورۃ المائدۃ میں آیا ہے جو تکمیل شریعت کی سورت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ﴾ (المائدۃ:٦٦)

”اور اگر انہوں (اہل کتاب) نے قائم کیا ہوتا تورات کو اور انجیل کو اور اس کو جو کچھ نازل کیا گیا تھا ان پر ان کے رب کی طرف سے تو یہ کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔“

یعنی اگر اہل کتاب تورات اور انجیل اور قانونِ الٰہی کو نافذ کرتے تو اس کے نتیجے میں آسمان سے بھی اُن پر برکتوں کا نزول ہوتا اور زمین بھی اپنے خزانے اُگل دیتی۔ آج اگر ہم معاشی خوشحالی کے آرزومند ہیں‘ اگر غربت و افلاس کا خاتمہ چاہتے ہیں تو اِس کا راستہ اسلامی نظام ہے۔ اسلام کے نظامِ عدل ہی سے معاشی آسودگی کی منزل حاصل ہوگی۔ نفاذ شریعت کی ایک اور برکت جرائم کے خاتمے کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ طالبان دور کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ افغانستان میں نفاذِ شریعت کے نتیجے میں مکمل امن وامان قائم ہوا‘ لوگوں کو فوری انصاف ملا اور آناً فاناً جرائم کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ ساری چیزیں آج ہمارے لیے ایک خواب ہے۔ عدالتوں میں چلے جائیں تو لگتا ہے کہ سب لوگ مقدمات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جیل کو دیکھیں تو لگتا ہے ساری قوم جیل کی سلاخوں کے پیچھے آگئی ہے۔ کوئی پرسانِ حال نہیں‘ غریب دھکے کھا رہا ہے‘ حصولِ انصاف کے لیے نسلیں انتظار کرتی ہیں لیکن انصاف نہیں ملتا‘ جبکہ طالبان کے افغانستان میں لوگوں کو سستا اور فوری انصاف مل رہا تھا۔ طالبان کے دورِ حکومت میں ڈاکٹر جاوید اقبال کو بھی افغانستان جانے کا موقع ملا۔ اقبال کا یہ فرزند ملائیت کا سخت دشمن ہے‘ اسے تقلید سے سخت الرجی

ہے جبکہ وہاں تو سبھی ملا تھے اور تقلید بھی جامد تھی۔ مگر اُس نے ملائیت کا سخت مخالف ہونے کے باوجود واپس آ کر جو گواہی دی وہ ہمارے دانشوروں کے لیے قابل غور ہے۔ اُس نے کہا کہ ’’طالبان نے افغانستان میں شریعت نافذ کر کے جو مثال پیش کی ہے‘ اگر دو چار اور اسلامی ممالک بھی یہ کام کریں تو پوری دنیا مسلمان ہو جائے گی۔‘‘

طالبان کی استقامت‘ توکّل علی اللہ اور کامیابی کا سبق یہ ہے کہ جس قوم کی پشت پر اللہ کی مدد ہو‘ فتح و کامرانی اُسی کو ملے گی اور اُس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ آج ہمیں اللہ کی مدد درکار ہے اور یہ مدد حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس کے وفادار بن جائیں اور اس کے دین کو نافذ اور قائم کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا اور ہماری دین سے بے وفائی اور غداری جاری رہی اور اللہ تعالیٰ نے ہم سے مدد کا ہاتھ روکے رکھا تو پھر کوئی نہیں ہے جو ہماری مدد کر سکے۔ یہ ہے قرآن کی راہنمائی! علامہ اقبال نے جوابِ شکوہ میں یہی بات کہی ہے ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا!

اور ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

حکیم الامت علامہ اقبال نے اس حوالے سے ہمارے مرض کی صحیح تشخیص اور علاج تجویز کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں!

انہوں نے بہت جامع لفظ استعمال کیا: یعنی ’’محمد ﷺ سے وفا‘‘۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے وفا ہی ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ اور محمد ﷺ سے وفاداری کا مطلب آپؐ کے اسوہ و سیرتِ مطہرہ پر چلتے ہوئے‘ اللہ کی کتاب سے اور اللہ کے دین سے وفاداری ہے۔ اقبال نے ایک لفظ میں ساری بات سمیٹ لی۔ افسوس کہ آج بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ سے وفاداری کا دم تو بھرتے ہیں لیکن مقامِ رسالت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ وہ قرآن حکیم کا سہارا لے کر رسول اللہ ﷺ کے مقامِ رفیع کو گھٹانے کی ناپاک سازش کر رہے ہیں‘ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست!

(یعنی اپنے آپ کو محمد ﷺ تک پہنچا دو کہ دین نام ہی آپؐ کے طریقے کا ہے۔ اگر تم محمد ﷺ کو یہ مقام نہیں دو گے تو پھر یہ دین نہیں‘ سب بولہبی ہے۔)

اسلام اور استحکامِ پاکستان: لازم و ملزوم

ساری گفتگو کا حاصل اور تمام مسائل کا حل ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہم نفس‘ دولت اور امریکہ کی غلامی چھوڑ کر رب کی غلامی اور وفاداری اختیار کریں۔ تنظیم اسلامی کا نعرہ ہے: ’’امریکہ سے رشتہ توڑو‘ رب سے ناتا جوڑو‘‘۔ اگر ہم فی الواقع یہ کام کر لیں تو آزمائشیں تو آئیں گی‘ لیکن پھر اس کے نتیجے میں ہمیں اللہ کی مدد حاصل ہو گی۔ چنانچہ کوئی بھی ہمارا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ بس ہمیں اپنا قبلہ سیدھا کرنے کے لیے یوٹرن لینا ہے۔ اللہ کی غلامی اختیار کریں گے تو تمام غلامیوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیں کہ ہماری اُخروی نجات اور ملک کا استحکام دونوں اسلام سے جڑے ہوئے ہیں۔ اللہ سے وفاداری اور دین کے تقاضوں پر عمل کرنے سے ہمیں آخرت کی حقیقی کامیابی بھی حاصل ہو گی اور اسی سے پاکستان مستحکم ہو گا۔ گویا پاکستان کی بقا‘ سالمیت اور استحکام‘ اسلام کے ساتھ رشتہ مضبوط کرنے سے ہو گا۔ پاکستان بنا ہی اسلام کے نام پر ہے‘ اس لیے کسی اور نظام اور طریق سے آپ اِس کو مستحکم نہیں کر سکتے۔ دین کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے سے ہماری آخرت سنور جائے گی۔ لہٰذا جس شخص کو بات سمجھ میں آ گئی ہے وہ آج ہی سے اس پر کام شروع کر دے۔ اس لیے کہ ہمارا اصل مسئلہ ہی اُخروی نجات ہے۔ اگر وہاں پر پکڑے گئے (معاذ اللہ) تو دنیا کی ساری نعمتیں بھول جائیں گی۔ اور اگر اللہ‘ اُس کے رسول اور دین کے وفادار بن جائیں گے تو اللہ کی طرف سے یہ گارنٹی موجود ہے کہ وہ ہمیں فوز و فلاح سے ہمکنار کرے گا۔

حاضرین کے لیے میرا پیغام!

رفقاء و احباب! آخر میں‘ میں آپ کو ایک پیغام دے رہا ہوں۔

رفقاء تنظیم کے نام میرا پیغام ہے کہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ اس نے ساری باتیں ہم پر کھولیں اور قرآن و سنت کے ساتھ ہمارا رشتہ جوڑا۔ آپ تنظیم اسلامی میں ایک عہد کر کے آئے ہیں‘ لیکن جو عہد آپ نے کیا ہے اُس کے حوالے سے آپ کو چوکنا رہنا ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں تک پہنچنے کے بعد ہم ’’لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ‘‘ کی وعید کا مصداق قرار پائیں۔ اس عہد کی پابندی کے تقاضوں کو ہمیں اوّلین ترجیح دینی ہو گی‘ ورنہ ہم خود فریبی کا شکار

ہو جائیں گے۔ اللہ نے ہمیں دینی ذمہ داریوں کا جو شعور بخشا ہے' یہ اُس کا بہت بڑا فضل ہے' جس پر اُس کا صمیم قلب سے شکر ادا کرنا چاہیے۔ پھر یہ کہ اس شعور کا ذریعہ جو شخصیت بنی یعنی بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ اُن کے لیے بھی دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں اور جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے۔ (آمین!)

وہ دوست احباب جو ابھی اس قافلہ میں شریک نہیں ہوئے' اُن کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ رب کی رضا اور رب کی وفاداری کا جو پیغام آپ تک پہنچا ہے' اخروی نجات کے عظیم مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے لیے کمر بستہ ہو جائیں۔ والد محترمؒ اپنے سامعین کو یہ نصیحت فرماتے تھے کہ اپنی اصلاح کیجیے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ فریضۂ اقامت دین کے لیے کسی ایسی اجتماعیت کا حصہ بنیں جس کا اولین مقصد پاکستان میں نفاذِ شریعت اور غلبۂ دین حق ہو۔ اس مقصد کے لیے بہت سی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ آپ کسی بھی جماعت میں شامل ہو جایئے' لیکن اس ضمن میں تین باتوں کا خیال رکھیے: پہلی یہ کہ وہ جماعت ایسی ہو جس کا واحد ہدف یہ ہو کہ اس ملک میں اللہ کا دین قائم ہو جائے' یعنی وہ غلبہ و اقامتِ دین کے لیے تشکیل پائی ہو۔ دوسرے جماعت کی قیادت کے قریب ہو کر دیکھئے کہ آپ کو ان سے خلوص کی خوشبو آتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بہروپ بھرے' آپ کچھ عرصے قریب رہیں گے تو وہ بہروپ کھل جائے گا۔ جب آپ نے اتنے بڑے دینی کام کے لیے محنت کرنی ہے تو ان جماعتوں اور ان کے قائدین کو قریب سے دیکھیں۔ آپ کو ایک جوتا بھی خریدنا ہو تو پہلے دس دکانیں دیکھتے ہیں' پھر جوتا خریدتے ہیں' لیکن جب کہا جاتا ہے کہ کسی دینی جماعت میں شریک ہو جاؤ تو آپ کہتے ہیں کہ کون سی جماعت میں شامل ہوں' سب ایسے ہیں' ویسے ہیں! یہ اندازِ فکر دراصل دینی جدّوجہد سے فرار کا بہانہ ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ غلبۂ دین کے نبوی مشن کے لیے یہ بھی دیکھیں کہ جو جماعت یہ کام کر رہی ہے اس کا طریقہ نبوی طریق کار کے مطابق یا اُس کے قریب ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ ہمیں منہج بھی وہی اختیار کرنا ہے جو نبی آخر الزمان ﷺ سے ہمیں ملا۔ ان تین باتوں کو دیکھ کر آپ کسی بھی دینی اجتماعیت کا حصہ بن جایئے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

اعتصامش کُن

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ

(اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ‘ جڑ جاؤ!)

حافظہ منزّہ رشید

قرآن کریم ہر دور کے فتنوں سے بچانے والا ہے

حضرت حارث بن اعور ؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ (کوفہ کی) مسجد میں لوگوں کے پاس سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ لایعنی باتوں میں مشغول ہیں۔ میں حضرت علی ؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے انہیں اس چیز کی خبر دی کہ لوگ اس طرح مسجد میں بیٹھے ہوئے فضول باتیں کر رہے ہیں۔ حضرت علی ؓ نے فرمایا: کیا لوگ واقعی ایسا کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا ہاں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے:

((اَلَا اِنَّهَا سَتَكُوْنُ فِتْنَةٌ)) فَقُلْتُ مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ: ((كِتَابُ اللّٰهِ‘ فِيْهِ نَبَأُ مَا كَانَ قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ‘ وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ‘ مَنْ تَرَكَهٗ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ ‘ وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى فِيْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ ‘ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ ‘ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ ‘ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ ‘ هُوَ الَّذِىْ لَا تَزِيْغُ بِهِ الْاَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْاَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَلٰى كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِىْ عَجَائِبُهٗ ‘ هُوَ الَّذِىْ لَمْ تَنْتَهِ الْجِنُّ اِذْ سَمِعَتْهُ حَتّٰى قَالُوْا : ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِىْ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ مَنْ قَالَ بِهٖ صَدَقَ‘ وَمَنْ عَمِلَ بِهٖ اُجِرَ‘ وَمَنْ حَكَمَ بِهٖ عَدَلَ‘ وَمَنْ دَعَا اِلَيْهِ هُدِىَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ)) (رواہ الترمذی والدارمی)

’’آگاہ ہو جاؤ‘ عنقریب ایک بڑا فتنہ برپا ہونے والا ہے!‘‘ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس (فتنہ کے شر سے بچنے اور) نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’کتاب اللہ! اس میں تم سے پہلی اُمتوں کے واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اطلاعات ہیں اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں اُن کا حکم اور فیصلہ موجود ہے۔ وہ قولِ فیصل ہے‘ فضول بات نہیں ہے۔ جو کوئی جابر و سرکش اس کو چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا‘ اور جو کوئی ہدایت کو قرآن کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے صرف گمراہی آئے گی۔ قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے‘ اور وہی محکم نصیحت نامہ ہے‘ اور وہی صراط مستقیم ہے۔ وہی (وہ حق مبین) ہے جس کے اتباع سے خیالات کجی سے محفوظ رہتے ہیں‘ اور زبانیں اس کو گڑبڑ نہیں کر سکتیں‘ اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے‘ اور وہ کثرتِ مزاولت سے کبھی پرانا نہیں ہوگا‘ اور اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ (قرآن کی یہ شان ہے کہ) جب جِنّوں نے اس کو سنا تو بے اختیار بول اٹھے: ’’ہم نے قرآن سنا ہے جو عجیب ہے‘ رہنمائی کرتا ہے بھلائی کی‘ پس ہم اس پر ایمان لے آئے‘‘۔ جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی‘ اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا۔ اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا‘ اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہوگئی!‘‘

قرآن مجید کی عظمت

قرآن مجید فرقان حمید عظمت‘ فضیلت و اہمیت‘ شان و جلالت‘ حکمت و موعظت اور دانائی و پارسائی کا وہ عظیم سرچشمہ ہے جسے اللہ ربّ العالمین نے اپنے پیارے محبوب اور نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ پر بذریعہ وحی نازل فرمایا۔ حدیث مبارکہ کی رو سے اللہ ربّ العزّت کے اس بابرکت کلام قرآن کریم کو دوسرے تمام کلاموں پر وہی فضیلت اور برتری حاصل ہے جو خود ربّ کائنات کو اپنی تمام مخلوق پر ہے۔ قرآن کریم اپنی شان‘ اپنی زبان‘ اپنے احترام و ادب‘ اپنی تعلیم و حکمت‘ اپنی موعظت و نصیحت نیز ہر لحاظ سے ایک معجز اور اعلیٰ مرتبہ و مقام کی حامل کتاب ہدایت ہے۔ جس وقت یہ بابرکت کلام نازل ہوا تھا اس وقت بھی انسان اس کی مانند کلام بنا کر لانے سے عاجز تھے‘ آج بھی ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

قرآن کریم لافانی وانقلابی کتاب

قرآن کریم ہی اللہ ربّ العزت کی وہ لافانی کتاب ہے جو ہر دور میں پوری نوعِ

انسانیت کے لیے منبع و سرچشمۂ ہدایت‘ سب سے بڑی روحانی طاقت اور زندگی گزارنے کے لیے مکمل دستور و ضابطۂ حیات رہی ہے — تاقیامت آنے والے انسان صرف اسی ایک پاک کلامِ ربّانی سے رُشد و ہدایت حاصل کر کے دنیا و آخرت کی خیر و بھلائیاں اور کامیابیاں حاصل کرسکتے ہیں۔

قرآن کریم نہ صرف ایک زندہ اور مسلسل معجزہ ہے بلکہ یہ کتابِ حیات اور کتابِ انقلاب ہے جو انسانی طرزِ حیات کو پوری طرح بدل دینے والی ہے۔ یہ لوگوں کے قلوب و اذہان کو پستی سے نکال کر ان کو رفعتوں کے اوجِ ثریا تک پہنچا دینے والی ہے۔ یہی وہ کتاب انقلاب ہے جو عقائد کی درستگی کی نشاندہی کرتی ہے اور اخلاق‘ تزکیۂ نفس‘ عبادات‘ معاشرت‘ معیشت‘ سیاست‘ تہذیب و تمدّن‘ عدالت‘ قانون‘ غرض حیاتِ انسانی کے ہر ہر پہلو پر ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کرتی ہے۔ قرآن کریم ہی دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جس نے انسان کے افکار‘ اس کی سوچ‘ اس کے رویّے اور اس کی طرزِ زندگی پر اتنی وسعت‘ اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے کہ دنیا کی کسی اور کتاب کے حوالے سے اس طرح کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا۔ نہ صرف ان کے قلوب و اذہان کو بدلا بلکہ ان کی طرزِ زندگانی‘ رہن سہن کے طریقے‘ کھانے پینے‘ اٹھنے بیٹھنے‘ چلنے پھرنے‘ سونے جاگنے الغرض ہر طریقہ کو بدل کر سلیقے اور توازن کا نظامِ زندگی عطا کیا اور پھر اسی قوم نے دُنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا — خلافت راشدہ کے دور کا تصور ذہن میں لائیں تو وہاں ہمیں عجیب امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ دکھائی دیتا ہے۔ ہر طرف خوشحالی کا یہ حال تھا کہ لوگ ہاتھوں میں زکوٰۃ لیے پھرتے تھے لیکن کوئی اسے لینے والا نہ تھا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج ان کے قدموں میں تھے۔ امن و امان کی حالت دیکھیں تو وہ اس سے بھی عجیب تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ حضور ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق زیورات سے لدی پھندی عورت مکہ سے صنعاء تک جاتی تھی اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوتا تھا۔

یہ عجیب برکات اس سبب سے تھیں کہ انہوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں قرآن سے وفاداری کی تھی‘ اسے اپنا امام بنا کر رکھا تھا‘ تو قرآن نے بھی ان کو وہ سربلندی و سرفرازی اور سرخروئی عطا فرمائی جس کی آج دنیا بھر میں مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ قرآن کی تعلیمات ایسی ہی زندہ و جاوید اور معجزانہ ہیں کہ جس قوم و ملّت نے بھی اسے اپنایا اور اس پر اپنی طرزِ زندگی استوار کی تو تاریخ گواہ ہے کہ وہی قومیں عزت اور افتخار کے نشان اپنے ماتھے پر سجائے دنیا پر حکومت کرتی رہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

> ((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) (صحیح مسلم)
>
> ’’اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے سے کچھ قوموں کو عروج تک پہنچائے گا اور اسی کے (ترک کرنے کے) سبب کچھ کو ذلیل و خوار کر دے گا۔‘‘

قرآن کریم اس نوعیت کی کتاب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اسے لکھ کر نبی آخر الزّمان حضرت محمد ﷺ سے کہہ دیا ہو کہ اسے شائع کر کے لوگوں کو ایک خاص رویہ زندگی کی طرف بلائیں۔ نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں کہ جس میں محض نظری اور کتابی باتیں ہوں۔ بقول صاحبِ تفہیم القرآن سید مودودیؒ:

> ’’کفارِ مکہ کے ساتھ طویل اور شدید کشمکش کے دوران میں اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبیؐ پر پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی‘ سیلاب کی سی قوت اور تند و تیز آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو ان کے ابتدائی فرائض بتائے گئے اور ان کے اندر اجتماعی شعور پیدا کیا گیا۔ انہیں تقویٰ‘ فضیلت‘ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کی تعلیم دی گئی۔ انہیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدّ و جہد کرنے پر اُبھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفتوں کے بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔‘‘

اُمّتِ مُسلمہ کے زوال کا سبب

آج مسلمانوں کی حیثیت خزاں رسیدہ پتّوں کی مانند ہو چکی ہے۔ ہر طرف سے کفار انہیں مغلوب کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ مسلمان خوف‘ بے اطمینانی اور پریشانیوں کا شکار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے قرآنی تعلیمات کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ قرآن کی ہدایت کے مطابق عدل و انصاف پر مبنی معاشرہ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ علماء کرام زبانی کلامی دعوے کرتے رہتے ہیں‘ پدرم سلطان بود کے قصے سناتے رہتے ہیں اور اسلامی فلاحی ریاست کی برکات کے بارے میں بڑے بڑے تاریخی واقعات بیان کرتے رہتے ہیں‘ مگر آج کی دنیا میں سوا ارب کی تعداد سے زیادہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کی بات نہیں سنی جاتی۔

قرآن سے بے اعتنائی کا عالَم یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے ہی اس کتابِ انقلاب کو غلافوں اور جُزدانوں میں مقیّد و محبوس کر کے اسے طاقوں میں سجا رکھا ہے اور اسے کارنسوں کی زینت بنا رکھا ہے' مگر اسے ایک کتابِ ہدایت کے طور پر اپنے ایوانوں' اپنی عدالتوں' اپنی تجارتی منڈیوں' اپنے بازاروں اور اپنے کالجوں سکولوں سے بے گانہ کر رکھا ہے۔ اس کتابِ مبین سے اپنی زندگیوں کو منور کرنے اور ساری دنیا کو اس کی روحِ انقلاب سے آشنا کرنے کی بجائے ہم اسے خوشبو میں بساتے' آنکھوں سے لگاتے اور ''سَروں'' پر بھی اٹھا لیتے ہیں' مگر اس کی روحِ انقلاب سے خود بھی محروم ہیں اور ہم نے دنیا کو بھی اس سے محروم کر رکھا ہے۔

آج سب سے زیادہ ضرورت و اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم قرآن کریم پڑھنے پڑھانے' سمجھنے سمجھانے کے عمل کو بہت زیادہ اور جس میں جتنی استطاعت ہے اتنے بڑے پیمانے پر عام کرنے کی جدّوجہد کریں۔ لہٰذا ان تمام لوگوں کو توجہ کرنی چاہیے جو دُنیوی تعلیم و ترقی کو اپنی معراج بنائے ہوئے ہیں کہ کیا انہوں نے قرآن کی تعلیم کو بھی ویسے ہی پڑھنے اور اسے اپنی زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کی ہے جیسے دُنیوی تعلیم کو! یقیناً یہاں دُنیوی تعمیر و ترقی اور علم حاصل کرنے سے منع کرنا مقصود ہرگز نہیں (بلکہ ہمیں تو پڑھنے' علم حاصل کرنے اور کائنات میں غور و فکر کا حکم بھی ہے) بس سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہم اوّلین ترجیح کس چیز کو دے رہے ہیں' کس چیز کو ہم نے مقدّم رکھا ہے اور کس چیز کو مؤخّر۔ اس بات کو ہم ایک واقعہ سے یوں سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطّاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تورات کا ایک نسخہ لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ' یہ تورات کا ایک نسخہ ہے۔ آپؐ خاموش رہے۔ پھر حضرت عمرؓ اسے پڑھنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: عمر! تمہاری ماں تمہیں گم کرے' رسول اللہ ﷺ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھتے؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نظر اُٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے چہرے کی طرف دیکھا تو پکار اٹھے: ''میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں اللہ کی ناراضگی سے اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی سے۔ ہم راضی ہیں اللہ کو رب مان کر' اسلام کو بطور دین قبول کر کے اور محمد ﷺ کو نبی مان کر'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے' اگر تمہارے سامنے موسیٰ علیہ السلام ظاہر ہو جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرو تو تم لازماً سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پا لیتے تو لازماً میری پیروی کرتے۔'' (سنن الدارمی' المقدمة)

اس واقعہ سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ساری زندگی کوئی کتاب' چاہے وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو' نہیں پڑھتا' لیکن قرآن پڑھتا ہے تو کیا اس سے کوئی مواخذہ ہوگا کہ فلاں کتاب کیوں نہیں پڑھی؟ لیکن اگر کوئی محقق ہے' ادیب ہے' پروفیسر ہے' ڈاکٹر یا سائنسدان ہے' اگر سب کچھ پڑھ لیتا لیکن قرآن کو پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی تو اللہ کی عدالت میں قیامت کے دن اس شخص کے خلاف دعویٰ دائر کیا جائے گا اور مدّعی ہوں گے پیغمبرِ آخرالزّماں حضرت محمد ﷺ۔ اس کا ذکر سورۃ الفرقان میں اس طرح ہوتا ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ﴿٣٠﴾﴾

> ''اور کہا پیغمبر (ﷺ) نے اے میرے پروردگار! بے شک میری اُمّت نے اس قرآن کو چھوڑ (کر پسِ پشت ڈال) رکھا تھا۔''

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اس دن ہمارے بچنے کا کیا امکان ہوگا جب اللہ کا رسول ﷺ قرآن سے تغافل برتنے پر ہمارے خلاف بارگاہِ ربّ العزت میں استغاثہ دائر کریں گے؟ ہمارا کیا حال ہوگا جب اللہ کا رسول ہمارے مہجوریٔ قرآن کا شکوہ کریں گے؟

قرآن کا شکوہ

قرآن دوسروں کا اتنا شاکی نہیں جتنا اسے اپنے ماننے والوں سے شکوہ ہے' بلکہ قرآن فریاد کناں ہے کہ مجھے جزدانوں میں سجانے کی بجائے اپنے سینوں میں بساؤ' مجھے اپنے ایوانوں اور عدالتوں میں لاؤ اور میری انقلابی روح سے فائدہ اٹھاؤ اور دنیا کو بتاؤ کہ میری تعلیمات پر عمل کر کے دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اور بدامنی' دہشت گردی اور بدحالی سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے تیئیس سال دن رات مشکلات اور مصائب کو برداشت کر کے نہ صرف اللہ کے قرآن کو بھرپور انداز میں دوسروں تک پہنچایا' بلکہ اس آخری ہدایت نامے کی بنیاد پر ایک مربوط اور مستحکم اسلامی نظامِ حکومت قائم کر کے رہتی دنیا تک مثال قائم کر کے دکھائی کہ یہ ہے اللہ کا بتایا ہوا صحیح اور سیدھا راستہ اور قرآن کے مطابق قائم کیا ہوا نظام۔

خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع کی طرف اشارہ کر کے ان سے دین کے پہنچا دینے کی گواہی لی اور ان پر حجت قائم کرنے کے بعد حکم دیا:

((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) (متفق علیہ) ''پس چاہیے کہ حاضر غائب تک پہنچا دے!''

آپ ﷺ نے اپنے مشن کی تکمیل کے بعد بقیہ پوری نوعِ انسانی تک اللہ کے کلام کو پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آيَةً)) (بخاری) ''پہنچاؤ میری طرف سے چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو''۔ یعنی قرآن کا جتنا علم اللہ تعالیٰ نے جس کو دیا ہو وہ اتنا ہی دوسروں تک پہنچائے اور تبلیغِ قرآن کے اس نبوی مشن میں اپنا حصہ ادا کرے اور ہمیشہ اس مبارک حدیث کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھے:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) (صحيح البخاری)

''تم میں بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔''

ہم میں سے ہر شخص بہترین مستقبل کے خواب سجاتا ہے اور پھر اسی کے مطابق پلاننگ کرتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم مندرجہ بالا حدیث کی پیروی کرتے ہوئے ایسی چیز کو اپنائیں جو دنیا و آخرت میں ہمارے لیے باعثِ عزّت وافتخار ہے اور آخرت کی کامیابی کی ضامن بھی ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر ایک کی یہی ترجیح ہونی چاہیے کہ ہم اپنے بہتر مستقبل کا انتخاب کرتے ہوئے قرآن کریم ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں' کیونکہ قرآن ایسی ہی عظمتوں اور رفعتوں والی کتاب ہے جس کو دیکھنا بھی عبادت' پڑھنا بھی عبادت' پڑھانا بھی عبادت' سننا بھی عبادت' سنانا بھی عبادت' دوسروں کو اس کی طرف بلانا بھی عبادت اور پھر اس پر عمل کرنا اور اسی کی پیروی کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارنا سب عبادتوں سے بڑی عبادت ہے۔

یہی تو وہ ہدایت نامہ ہے جو بھٹکے ہوؤں کو سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔ یہی وہ رہنما ہے جو ''اسفل سافلین'' کی سطح پر گرے ہوؤں کو ایمان اور عمل صالح کی شرط پوری کرنے پر اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ جیسی لازوال نعمتوں سے مالا مال کر دینے والا ہے۔ یہ ایسا بہترین نصیحت نامہ ہے جو شیطان کی پیروی کرنے والوں کو رب العالمین کی بندگی پر لگا دینے والا اور اس کے قرب کا ذریعہ بنا دینے والا ہے۔ ہم میں سے کون ہے جو کسی سہارے اور کسی ٹھنڈی چھاؤں کی تلاش میں نہیں؟ ہم میں سے کون ہے جو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر کسی ایسے در کی تلاش میں نہیں جس میں پناہ لے کر وہ دنیا کے تمام مصائب و آلام کو بھول نہ جانا چاہتا ہو؟ ہم اپنے قرآن سے رجوع کریں' اس سے ایسی ہستی کا پتا پوچھیں تو وہ ہمیں بے خبر نہیں رکھتا' فوراً راہ دکھاتا ہے۔

قرآن حبل اللہ ہے

سورۃ الحج آیت ۷۸ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ ''اپنے اللہ سے چمٹ جاؤ' اپنے اللہ سے جڑ جاؤ۔''

وہ اللہ جو ستّر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے' جو رؤف بالعباد ہے' جو فرماتا ہے: ﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ﴾ (الزمر:۵۳) ''اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو' بے شک اللہ تمام گناہوں کو بخشنے کا اختیار رکھتا ہے'' — ہم سوچیں گے کہ ہم اپنے اللہ سے کیسے چمٹ سکتے ہیں' کیونکہ ہم اسے ان ظاہری آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ قرآن یہاں پھر ہماری رہنمائی کرتا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اور اللہ کی رسّی کو سب مل کر تھام لو''۔ یہ حبل اللہ کیا ہے؟ اس آیت مبارکہ کی مزید وضاحت کے لیے ہم اپنے نبی محترم حضرت محمد ﷺ کی احادیث مبارکہ کی طرف رجوع کریں تو وہاں ہمیں بہت پیاری وضاحت ملتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا وَاِنِّیْ تَارِكٌ فِيْكُمْ ثَقَلَيْنِ اَحَدُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ......)) (مسلم)

''آگاہ رہو' میں تمہارے درمیان دو خزانے چھوڑے جا رہا ہوں' ان میں سے ایک کتاب اللہ (یعنی قرآن) ہے (اور) وہی حبل اللہ ہے......''

ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كِتَابُ اللّٰهِ حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ)) (ترمذی)

''اللہ کی کتاب کو (تھامے رکھنا) جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ایک رسی ہے۔''

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهُ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ كِتَابُ اللّٰهِ)) (مسلم)

''اور میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑ لوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے' اور وہ ہے کتاب اللہ۔''

امام طبرانی کی معجم کبیر کی ایک روایت میں یہ نقشہ کھینچا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے حجرۂ مبارکہ سے برآمد ہوئے تو دیکھا کہ چند صحابہ کرام ؓ مسجد کے گوشے میں بیٹھے قرآن کریم کا مذاکرہ کر رہے ہیں' قرآن کو سمجھ رہے ہیں اور سمجھا رہے ہیں۔ آپ ﷺ ان کے پاس تشریف

لائے اور بڑا پیارا سوال کیا:

((اَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟))

’’کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟‘‘

صحابہ کرامؓ نے جواب دیا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول، ہم اس کے گواہ ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ، فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَضِلُّوْا وَلَنْ تَهْلِكُوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا))

’’پس تم خوشیاں مناؤ، اس لیے کہ یہ قرآن وہ شے ہے جس کا ایک سِرا تمہارے ہاتھ میں اور دوسرا سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا تم اسے مضبوطی سے پکڑ لو، کیونکہ اس کے بعد تم کسی صورت میں نہ گمراہ ہوگے اور نہ کبھی تباہ حال اور پریشان ہوگے (کیونکہ اسی رسّی کے ذریعے تمہاری اللہ تعالیٰ تک رسائی ہو جائے گی)۔‘‘

امرِ واقعہ یہ ہے کہ دُنیا کے غموں اور فتنوں سے نجات کے لیے قرآن کے سوا ہمارا کوئی سہارا نہیں جو ہمیں گمراہیوں سے بچا کر راہِ ہدایت پر گامزن کر دے اور ہمیں اللہ وحدہٗ لاشریک کے اتنا قریب کر دے جتنا کہ اس آیت مبارکہ میں قریب ہونے کی عظیم خوشخبری ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (۷۸)﴾ (الحج)

’’اور وابستہ ہو جاؤ اللہ کے ساتھ۔ وہی تمہارا مولیٰ ہے، سو کیا ہی اچھا ہے وہ مولیٰ اور کیا ہی اچھا ہے وہ مددگار!‘‘

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ساتھ چمٹ جانے کی توفیق نصیب فرمائے اور ہمیں قرآن کریم پڑھنے، سمجھنے، عمل کرنے، پھیلانے اور اس کو نافذ کرنے کی توفیق دے۔ آمین!

خلاصۂ کلام کے طور پر قرآن کی ایک آیت ملاحظہ ہو:

﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۲۹)﴾ (الدھر)

’’بے شک یہ تو نصیحت ہے، پس جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔‘‘

* * *

تربیتِ اولاد میں حیا کا عنصر

نگہت حسین

اولاد ماں باپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس لطیف‘ خوبصورت‘ زندگی سے بھرپور اور معصوم نعمت کے حصول کے لیے پیغمبروں نے بھی اپنی اپنی التجا اللہ ربّ العزّت کے سامنے دُعا کی صورت میں رکھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے صالح اولاد کے لیے دعا فرمائی‘ جو سورۂ آل عمران میں اس طرح موجود ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۳۸﴾

”اے میرے ربّ! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما‘ بے شک تو دعا سننے والا ہے۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ میں اپنے رب کو پکارا:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۱۰۰﴾ (الصّٰفّٰت)

”اے میرے ربّ مجھے ایک صالح (لڑکا) عطا فرما۔“

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا ایک پاکباز‘ نیک و صالح اور امام اُمت کے لیے دعا تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی فرمانبرداری‘ اللہ کی اطاعت اور قربانی کا جذبہ ایک ایسا نشانِ راہ ہے جو اُمتِ مسلمہ کے لیے اپنی اولادوں کی تربیت کے لیے مثالی نمونہ ہے۔

تربیت کی اسلامی بنیادیں

بچوں کی تربیت کا کام والدین کی اصل ذمہ داری ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (التحریم:٦)

”اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو (جہنم کی) آگ سے۔“

بچوں سے متعلق منصوبے بنانا اور ان کے مستقبل کے لیے تگ و دو کرنا ایک فطری عمل ہے۔ ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے کامیابی و کامرانی کے ساتھ نمایاں مقام حاصل کریں۔ تاہم‘ صرف دنیاوی کامیابی کا تصور اس کوشش‘ جِدّ وجُہد اور ساری مساعی کو صرف اس فانی دنیا تک محدود کر دیتا ہے‘ جب کہ دنیا کی کامیابی و کامرانی بھی غیر یقینی ہوتی ہے۔ مؤمن کی اپنی ذات کا ایک ایک لمحہ اللہ ربّ العزت کی خوشنودی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے اولاد سے متعلق منصوبے اور خواہشات بھی اللہ کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے ہوتے ہیں۔ دنیا کی محدود کامیابی کے برعکس اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہاں کامیابی کا ایک وسیع تصور دیتا ہے‘ وہاں کامیابی کے ہمیشگی کے تصور کو سمجھنے کے لیے ایک خاص ذہنی بلوغت کا بھی مطالبہ کرتا ہے جس کا تعلق ایمان کی دولت اور خوفِ خدا رکھنے والے سے دل ہے۔ کامیابی کا یہ تصور جو قرآن میں جابجا موجود ہے تربیتِ اولاد کا ایک اہم جزو ہے۔ عصرِ حاضر میں جب طاغوتی قوتوں کی سربراہی میں ہر طرف اُمّتِ مسلمہ کے لیے فتنہ و فساد برپا ہے وہاں نسلِ نو کی اسلامی نہج پر تربیت ایک ایسی اہم ذمّہ داری ہے جس کا احساس ہنگامی بنیادوں پر کرنا ضروری ہے۔ اسلامی تاریخ ہمارے سامنے حضرت علیؓ‘ مُعاذ و معوّذ‘ مُصعب بن عمیر جیسے نوعمر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثالیں رکھتی ہے۔ دوسری طرف بہادر‘ جری‘ نوعمر محمد بن قاسمؒ جیسا سپہ سالار بھی اسی تاریخ کا حصہ ہے جو اپنی نوجوانی کے دور میں ہی اسلامی تاریخ میں اَنمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ آج اس عمر کو کھیل کود کے دن کہہ کر ضائع کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور یوں اُمتِ مسلمہ کا ایک گراں قدر سرمایہ اس مادی دنیا کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے‘ جس کا حاصل سوائے خسارے کے کچھ نہیں ہے۔

ابتدائی عمر اور بچے کی تربیت

بدقسمتی سے جس قدر ابتدائی عمر کو تربیتی حوالے سے اہمیت حاصل ہے اسی قدر اس عمر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق بچوں کی شخصیت کی تعمیر کا ۸۰ فی صد ابتدائی چھے سال کی عمر میں مکمل ہو جاتا ہے۔ باقی پوری زندگی اسی چھے سالہ تربیت کے محاسن کا عکس ہوتی ہے۔ اس عمر میں مزاج‘ عادتیں اور ذوق و شوق کو جس طرف لے جایا جائے گا اسی طرف بچے کا رجحان ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں عادت بنانا آسان بھی ہے اور ضروری بھی۔ اسلام اصلاح کا جو فطری طریقہ بتاتا ہے وہ بھی عادت پر ہی منحصر ہے۔ اسلام میں چھوٹے بچوں کی تربیت کے لیے تلقین کے ساتھ ساتھ عادت ڈلوانے کا فطری طریقہ اختیار کرنے کو کہا گیا ہے۔ ابتدائی عمر میں بچے کی سیکھنے کی صلاحیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ کے مطابق اس عمر کا بچہ ایک پاک و نفیس موتی کی مانند ہوتا ہے‘ لہٰذا اسے خیر کا عادی بنایا جائے تو وہ اسی میں نشو و نما پائے گا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو فطرتاً سلیم الطبع اور توحید پر پیدا ہوتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا ؕ لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰہِ ؕ﴾ (الروم: ۳۰)

''اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں تبدیلی نہیں۔''

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا مِنۡ مَوۡلُوۡدٍ اِلَّا یُوۡلَدُ عَلَی الۡفِطۡرَۃِ، فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوۡ یُنَصِّرَانِہٖ اَوۡ یُمَجِّسَانِہٖ)) (متفق علیه)

''ہر بچہ فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے' پھر اُس کے والدین یا اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بناتے ہیں۔''

گویا ماحول بچے کی پاکیزہ فطرت کو پراگندہ کرتا ہے۔ لہٰذا بچے کے لیے اردگرد کے افراد اور ماحول دونوں کا اسلامی حوالوں سے پاکیزہ ہونا بہت ضروری ہے' کیونکہ شخصیت پر موروثی اثرات سے زیادہ ماحول کی تربیت کا اثر پڑتا ہے۔ کہا جاتا ہے عادتیں صرف ۳۰ فی صد موروثی اور باقی ۷۰ فی صد ماحول سے بنتی ہیں۔

بچے کی تربیت کا پہلو یوں تو بہت ہمہ گیر اور وسیع ہے' لیکن اس کا اہم جزو تصورِ حیا ہے۔ اس مضمون میں اِسی پہلو کی طرف والدین اور مربی کی توجہ مبذول کروانا مقصود ہے تاکہ اسلامی معاشرے کی کمزور ہوتی اقدار کی طرف ہماری توجہ ہو۔

تصورِ حیا

اسلام میں تصورِ حیا شخصیت کا ایک اہم جزو ہے اور بنیادی اخلاقی صفت ہے۔ رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

((لِکُلِّ دِیۡنٍ خُلُقٌ وَخُلُقُ الۡاِسۡلَامِ الۡحَیَاءُ)) (موطأ مالك)

''ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور دین اسلام کا ممتاز اخلاق شرم وحیا ہے۔''

بچے کی اخلاقی تربیت کا ایک اہم عنصر تصورِ حیا ہے۔ معاشرے کی مضبوطی ایسے اخلاق و کردار کے لوگوں سے وابستہ ہے جن کا کردار شرم وحیا کا پیکر ہو۔ جب پورا معاشرہ بے حیائی اور فحش مناظر سے بھرا پڑا ہو' چاروں طرف بے ہودہ ہورڈنگز' فحش رسالوں' اخبارات' پوسٹروں کی بھرمار ہو اور سڑکوں' گھروں' مجالس اور محافل پر شیطانیت کی یلغار ہو' لوگوں کی گفتگو حتیٰ کہ موبائل فون پر بھیجے جانے والے پیغامات تک بھی فحش گوئی کے چنگل میں گرفتار ہوں' ایسے میں بچوں میں تصورِ حیا پیدا کرنا اور ابتدا ہی سے بچوں کے مزاج کا حصہ بنا دینا والدین و مربّی کا اہم

فرض ہے۔ حیا کے تصور کو مزاج کا حصہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ 'احتیاطی تدابیر' اور پرہیزگاری کا اصول اپنایا جائے' تاکہ بے حیائی کے قریب پائی جانے والی چیزوں سے بھی بچا جاسکے۔ بچوں کو ابتدائی عمر ہی سے حیا کا احساس دیں۔

گفتگو میں حیا

بچہ جب پیارے اور اچھے الفاظ بولتا ہے تو کتنا پیارا لگتا ہے۔ اگر اسے صاف ستھرے اور بھلے الفاظ سکھائے جائیں تو کتنا بھلا معلوم ہوگا۔ لیکن یہی ننھی ننھی زبانیں گالم گلوچ' بے ہودہ گانے' ٹی وی اور فلموں کے لچر مکالموں کو ادا کرنے لگیں تو سماعت پر انتہائی گراں گزرتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ الفاظ جو معصومیت اور ناسمجھی میں ادا ہوتے ہیں بچوں کی گفتگو کا حصہ بن جاتے ہیں' اور ان کو ایسی بے ہودہ گفتگو میں لطف آنے لگتا ہے۔ عام طور پر نومولود بچوں سے پانچ سال تک کے بچوں کے بارے میں یہ سوچ کر کہ یہ بچے ناسمجھ ہیں ہر طرح کی بات' فحش گوئی' لچر مذاق' اور دوسری بداخلاقیاں بغیر کسی شرم وحیا کے کرنا عار نہیں سمجھا جاتا ہے' حالانکہ یہ تمام باتیں ننھے سے ذہن میں بیٹھ جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یوں تصورِ حیا پر جو کاری ضرب پڑتی ہے وہ ابتدا ہی سے بچے کو بے حیائی کی ترغیب دے کر بے باک بننے پر اُکساتی ہے۔

زبان کو پاکیزہ رکھنے کے لیے غیر اخلاقی گفتگو' ناشائستہ الفاظ' گالی گلوچ' غیبت وجھوٹ سے بچنا بہت اہم ہے۔ حدیث ہے کہ ''انسان کوئی بات کرتا ہے اور اسے اتنا معمولی سمجھتا ہے کہ اسے کہنے میں کوئی حرج نظر نہیں آتا مگر درحقیقت وہ بدی ہوتی ہے' جس کے بدلے وہ ۷۰ برس کی راہ تک آگ میں گر جائے گا۔'' (ترمذی)۔ فضول گوئی کے علاوہ بچوں کو زبان کی آلودگی سے بچانا ہی دراصل زبان کو پاکیزہ بنانا ہے۔ زبان زدِ عام الفاظ بچہ سیکھتا ہی اپنے ماحول سے ہے۔ گھر کے بڑوں کی زبانوں پر بداخلاقی' بے ہودگی اور فحش گوئی بچے کو اس گندگی سے بے نیاز کردے گی۔ یوں بچہ ایسی ہی زبان کا عادی ہو جائے گا۔

شعور کی عمر آنے پر لڑکے اور لڑکیوں کو یہ بتانا بھی بہت ضروری ہے کہ خواتین مَردوں سے اور مرد خواتین سے میٹھے' پیارے' لوچ دار لہجے میں بات نہ کریں۔ جب بچے اپنے ماں' باپ' یا دیگر رشتہ داروں کو دیکھتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہی امی کی آواز بازار میں دکان داروں کے ساتھ انتہائی مٹھاس والی ہو جاتی ہے یا ابوجان ضرورتاً بھی کسی خاتون سے بات کرتے وقت بناوٹی تمیز اور شائستگی کی مٹھاس گھول لیتے ہیں' تو نوعمر ذہن اس تبدیلیٔ لہجہ اور الفاظ کو اپنا کر دوسروں کو متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاق کا حصہ بھی سمجھتا ہے۔ اسی لیے جب کبھی کوئی ایسا موقع آئے

جہاں بچوں کے ساتھ کسی بھی قسم کی خریداری یا کسی مرد وعورت ملازمہ سے بات کا مظاہرہ کرنا ہو تو بالخصوص اس بات کی تاکید کردی جائے کہ دکان دار کو اپنے مطلب کی چیز نکلوانے کے لیے اٹھلانا اور لاڈ دکھانا کسی طور بھی قابل قبول نہیں ہے۔ ڈرائیور‘ ملازم‘ دکان دار‘ اساتذہ سے بات کرنے کا شائستہ طریقہ سکھانا اور مناسب لہجہ جس سے کسی بھی قسم کی دلی بیماری اور بدنیتی کا شائبہ نہ رہے‘ حیا کا اہم جزو ہے‘ جس کی تاکید قرآن میں سورۃ الاحزاب میں کی گئی ہے۔ مسلمان عورتوں کے لیے اُسوۂ حسنہ امہات المؤمنین ؓ کو بایں الفاظ تلقین کی گئی ہے:

﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾﴾

’’اے نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو‘ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے‘ بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔‘‘

بلوغت کے بعد اس قرآنی آیت پر عمل کرنا اسی وقت آسان ہوگا جب بچپن سے اس کی عادت ہوگی۔ اسی لیے ایسی گفتگو جو ایمانی حالت کو تباہ کرنے کا باعث بنے اور شیطانی اثرات رکھتی ہو اس سے بچنا اور بچانا ایک مسلسل تربیت کا تقاضا کرتا ہے۔

لباس میں حیا

لباس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور حیا کے مظاہر میں سے ایک مظاہرہ لباس سے بھی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چھوٹے بچوں کے ساتھ عام طور پر بے حد لاپروائی اختیار کی جاتی ہے۔ بچوں کے کپڑے تبدیل کرنا‘ نہلانا‘ ڈایپر بدلنا جیسے تمام کام بعض اوقات لوگوں کی موجودگی میں کیے جاتے ہیں‘ جس میں بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی موجودگی بھی نظر انداز کردی جاتی ہے۔ بعض گھرانوں میں بچوں کو کپڑوں سے بے نیاز کر کے آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچوں کو مکمل برہنہ کر کے ایک ساتھ غسل کرنے کو بھی عار نہیں سمجھا جاتا ہے۔ بچیوں کو بچپن میں بغیر آستین اور کھلے گلے کی فراک و قمیص یا ٹانگیں کھلی رکھنے کو ایک عام فعل خیال کیا جاتا ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ:

’’چار سال سے کم عمر کا بچہ‘ چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی‘ اس کا جسم سترَ کے حکم میں نہیں۔ پھر جب وہ چار سال سے زیادہ کا ہوجائے تو اس کا مستور جسم شرم گاہ اور اس کے اطراف ہیں‘ بالغ ہونے پر ستر بالغ افراد کی طرح ہوگا۔ تاہم‘ بچے کو بچپن ہی سے پردے کا جتنا

عادی بنایا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔‘‘ (اسلام اور تربیت اولاد‘ شیخ عبداللہ ناصح علوان‘ ص ۷۱۵)

لہٰذا کپڑے تبدیل کرتے وقت ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیے جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ بعدازاں جب بچے اپنا لباس خود تبدیل کرنے کے عادی ہوجائیں تو ان کو بھی یہی ہدایت کرنی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

’’ستر دکھانے والے اور دیکھنے والے کو اللہ اپنی رحمت سے دُور رکھیں۔‘‘ (شعب الایمان ۶/۲۶۱‘ سنن بیہقی ۸/۹۹)

اگر ابتدا ہی سے بچوں کو اپنے جسم کو چھپانے اور اس کی حفاظت کرنے کی عادت نہیں ڈلوائی جاتی تو بچے بچپن ہی سے بے حیا اور بدنگاہ ہو جاتے ہیں۔ جن بچوں کو ہم اپنے شوق پورے کرنے کے لیے مغربی طرز کے ایسے لباس پہناتے ہیں جن میں ابتداء ہی سے ایک معصوم بچے کا تاثر ہونے کے بجائے حیا باختہ لڑکی یا لڑکے کا تصور پنہاں ہوتا ہے وہ دیکھنے والوں کو بھی اس معصوم کے اندر بچوں والی معصومیت کے بجائے لڑکا یا لڑکی تلاش کرنے کا موقع دیتا ہے۔ آئے دن اخبارات میں دل دہلا دینے والی خبریں آتی ہیں کہ درندہ صفت لوگ چھوٹی بچیوں کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ حیا کی پرورش اسی وقت ہی ممکن ہے جب اس کو بچے کے ننھے سے دل میں پروان چڑھنے کا موقع دیا جائے۔ فطری حیا کو ختم کرنے کے بجائے اس کو اُبھارا جائے تاکہ حیا بچے کی شخصیت کا لازمی جزو بن جائے۔ لہٰذا ایسے مرد و خواتین جن کے لباس حیا سے عاری ہوں دکھائی پڑنے پر بچوں میں اس لباس سے نفرت اور ناپسندیدگی کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ ایسی گڑیاں (خصوصاً باربی) جن کے لباس اسلامی لباس کے لحاظ سے مناسب نہیں ہوتے‘ نہ دلائی جائیں‘ اور بچوں کو اس کی وجہ بھی بیان کی جائے کہ اس کا لباس اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہے۔

روزمرہ زندگی میں حیا

عمرو بن شعیبؒ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا (عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَیْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ، وَفَرِّقُوْا بَیْنَهُمْ فِی الْمَضَاجِعِ)) (رواہ ابوداوٗد واحمد)

> ‘‘تمہارے بچے سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز کا حکم دو‘ اور جب ۱۰ سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز نہ پڑھنے پر مارو‘ اور ان کے بستر علیحدہ علیحدہ کر دو۔’’

اس نص سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ والدین شرعاً اس بات پر مامور ہیں کہ بچے جب ۱۰ سال کے ہو جائیں تو ان کے بستر الگ کر دیے جائیں تاکہ ایک ساتھ لیٹنے کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوغت کی عمر تک پہنچنے پر کبھی شیطان غالب آ جائے اور ان کے جذبات کو شیطانی رنگ دے دے۔ اسی طرح خلوت کا ماحول فراہم کرنا جس میں کزن آپس میں بے تکلفانہ ماحول میں موجود ہوں‘ یا ایسے انداز و اطوار کا خیال نہ کرنا جس میں نامحرم رشتہ دار بچوں سے زیادہ بے تکلف نہ ہوں‘ مستقبل کے مفاسد کا راستہ آسان کرتا ہے۔ احتیاط علاج سے بہتر ہے کا اصول اپنایا جائے تو ابتدا ہی سے ایک ایسا مزاج ڈھالا جا سکتا ہے جو اسلامی حدود کی پابندی کرنے والا ہوگا۔ ورنہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر زور زبردستی کرنے سے بچے میں بغاوت‘ چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو قیدی تصور کرتا ہے۔

بے حیائی کے محرّکات

بچے کی نیک صالح تربیت کے لیے اسلام ان تمام محرکات کا بھی قلع قمع کرتا ہے جو جذبات کو مشتعل کرنے اور نفس کو غالب کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

☆ ٹیلی وژن: بے حیائی کا ایک بڑا محرّک ٹیلی وژن ہے۔ مادّیت پرستی‘ نفسانیت‘ اور بے مقصد زندگی کی طرف مائل کرنے والا یہ ایک اہم ذریعہ ہے جس کے ابتدائی عمر سے ایسے زہریلے اثرات ہوتے ہیں کہ وہ پوری زندگی کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ ٹی وی میں عورت کا تقدس پامال کرنے‘ اس کو جنس بازار بنا کر پیش کرنے سے مرد کے ذہن میں عورت لطف اندوز ہونے کی اور عورت کے ذہن میں اپنے آپ کو سجا بنا کر پیش کرنے کی چیز کا تصور راسخ ہو جاتا ہے۔ بچے کا ذہن ابتدائی عمر سے ہی ٹی وی کی سحر انگیزیوں میں اس طرح جکڑ گیا ہوتا ہے کہ اس کے لیے زندگی کا مثالی نمونہ صرف اور صرف ٹی وی میں دکھائی جانے والی زندگی ہوتی ہے۔ گانے بجانے سے رغبت‘ بے حیائی کے مناظر سے لطف لینا‘ فحش مذاق شخصیت کا حصہ بننے لگتا ہے اور سنجیدگی‘ متانت‘ غور و فکر جیسی عادتیں کبھی پروان نہیں چڑھتی ہیں۔ غور و فکر اور تدبّر سے خالی اذہان کس طرح اپنے رب کی کبریائی بیان کر سکتے ہیں؟ اسی وجہ سے ایسے بچوں کے لیے اسلام ہمیشہ ان کا احساسِ کمتری بنا رہتا ہے۔

کارٹونز کے نام پر عجیب الخلقت کرداروں سے مانوس کروانا‘ ان کو ہیرو کے طور پر پیش کرنا اور پھر غیر معمولی طاقت کا مالک دکھانا بچے کے ذہن کو اللہ کی طاقت اور وحدانیت کے تصور سے خالی کر دیتا ہے۔ بچے کی نظر میں جب کارٹونز کے یہ مناظر گزرتے ہیں کہ ایک ہیرو بے پناہ طاقت کا مالک ہے‘ ناقابل شکست ہے‘ اس کو موت نہیں آتی ہے‘ تو اس کے ذہن میں کیا تصویر بنے گی‘ اس کا اندازہ کرنا ذرا بھی مشکل نہیں۔ بچپن ہی سے روپے پیسوں کا لالچ اور مادیت پرستی کا تصور دے کر ایسے شیطانی ذہن تیار کرنا جو بعد میں دجالی قوتوں کے ہی زیر اثر رہیں‘ آج کے میڈیا کا کام ہے۔ فلم‘ سنیما‘ سب اسی کی شاخیں ہیں‘ تاہم ٹی وی کی رسائی آج ہر گھر میں ہو چکی ہے اور اس کے زہر سے کوئی محفوظ نہیں‘ لہٰذا اس کی ہولناکی سے واقفیت خاص طور پر ضروری ہے۔ ٹی وی اسکرین کے سامنے وقت گزرنے کا ایمانی نقصان تو یہ ہے ہی کہ پوری شخصیت کی تعمیر اسی نہج پر ہو جاتی ہے جیسا شیطانی قوتوں کا مقصد ہے۔ تاہم‘ اس کے ضمنی اثرات میں بچے کے ذہن کا یکسوئی سے محروم ہو جانا‘ تعلیمی سرگرمیوں سے بددل رہنا اور دور بھاگنا‘ مطالعے کے شوق و ذوق کا پیدا نہ ہونا‘ ہر وقت غیر سنجیدہ رہنا‘ اور hyperactivity بھی شامل ہیں۔

☆ انٹرنیٹ: انٹرنیٹ دورِ حاضر کی اہم ترین ضرورت ہے۔ تعلیمی اور تحقیقی کاموں کے لیے اس کا استعمال ناگزیر ہو چکا ہے‘ تاہم یہ ایجاد نوجوانوں کے طبقے میں بے حیائی اور فحاشی کا ذریعہ بھی ہے۔ عام طور پر گھروں میں ٹی وی تو کسی نمایاں اور کھلے مقام پر رکھا ہوتا ہے لیکن کمپیوٹر ہمیشہ گھر کے کسی کونے کھدرے اور خلوت کے ماحول میں رکھا جاتا ہے۔ یہ خلوت دراصل شیطان کا ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔ کوشش کریں کہ کمپیوٹر گھر کے نمایاں مقام پر رکھیں جہاں ہمہ وقت کسی نہ کسی کی آمد و رفت ہوتی رہے۔ بچوں کے ساتھ اعتماد کا رشتہ قائم کریں اور ان سے کمپیوٹر و انٹرنیٹ پر کی جانی والی سرگرمیوں پر تبادلہ خیال کے ذریعے ایک دوسرے کو آگاہ کریں۔ انٹرنیٹ کے اوقات کار کو متعیّن کریں‘ ساتھ ہی ساتھ اس کے استعمال کو کسی اچھی کتاب کے مطالعے کی شرط سے بھی منسلک کر دیں تاکہ مطالعے کی عادت بہر صورت برقرار رہے۔ انٹرنیٹ و کمپیوٹر کی سرگرمیوں میں والدین جاسوس بننے کے بجائے دوست بن کر بچوں پر نگاہ رکھیں‘ تاہم جن امور پر سختی سے نمٹنے کی ضرورت ہو وہاں بے جا نرمی معاملے کو بگاڑ دے گی۔ اس کا فوری حل بھی کیا جائے اور توجہ بھی دی جائے۔ کمپیوٹر کے کاموں سے اتنی واقفیت ضرور حاصل کر لی جائے کہ بچے آپ کو اس سے نابلد نہ سمجھیں۔ مغربی معاشرے کا ایک

تصور پرائیویسی کا بھی ہے‘ بچوں کو اس تصور سے بچائیں‘ کیونکہ یہی گناہوں کی جڑ ہے۔ موبائل فون‘ انٹرنیٹ دونوں وہ زہریلے ہتھیار ہیں جن کو پرائیویسی کے نقطۂ نظر سے استعمال کرکے ’جو جی چاہے کرتے پھرو‘ کا اصول اپنایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان دونوں اشیاء کا انتہائی ضرورت کے تحت استعمال محدود کیا جائے اور خود بھی اس کو تفریح کا ذریعہ بنانے سے اجتناب کیا جائے۔

☆ **مخلوط محافل:** مخلوط محفل سے مراد ایسی تقاریب یا مہمان داریاں ہیں جہاں مرد و عورت ایک ہی نشست میں گفت و شنید کرتے ہوں‘ اور ان میں آپس میں بے تکلفی اور بے پردگی کا عام مظاہرہ ہو۔ ایسی محفل بچے کو ابتدا ہی سے بے حیا بنانے میں مدد دیتی ہے۔ خاندان کے جن افراد سے پردے کا حکم قرآن و حدیث کی رو سے موجود ہے اس کا بھرپور اہتمام کرنا‘ محرم‘ نامحرم کی حدود کا قائم کرنا اور میل ملاقات میں پردے کے اصولوں و ضوابط کا احترام کرنا ضروری ہے۔ کزنز کے نام پر بچوں کو بہن‘ بھائی بتا کر اس حد تک بے تکلف کر دیا جاتا ہے کہ ساری اسلامی حدود پامال ہوتی ہیں۔ ایسے میں بچوں کو اسلامی اخلاقی حدود کا پابند کرنا اور ان کو پردے کی اہمیت‘ غرض و غایت اور اس کے معاشرتی فوائد سے عقلی طور پر بھی قائل کرنا ضروری ہے تاکہ حجاب و ستر کے ایمانی تقاضے پورے ہو سکیں۔

☆ **موسیقی و فحش رسائل سے اجتناب:** مطالعے کا شوق ذہنی نشوونما‘ سنجیدگی‘ فکر و تدبّر کی گہرائی کے لیے از حد ضروری ہے۔ اس شوق کو پروان چڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو ان کی ذہنی سطح کے لحاظ سے کتابیں اور رسائل کا مطالعہ کرنے کو کہا جائے۔ مطالعہ کی عادت ہو جانے کے بعد بچوں کو مطالعے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے تربیت دی جائے اور مفید‘ با مقصد کتابوں کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تاکہ مطالعے کا مقصد حاصل ہو سکے اور یہ صرف ایک ذہنی لذّت نہ بن جائے۔ اکثر بچوں میں یہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ بغیر کسی رہنمائی کے مطالعے کا شوق اختیار تو کر لیتے ہیں‘ تاہم بعد ازاں یہ شوق انتہائی گھٹیا ذوق کے مظاہر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ فحش رسائل‘ بے مقصد کتابیں اور لایعنی قصے کہانیاں جن میں اخلاق سوز باتیں بھری ہوتی ہیں‘ ان سے ذہنوں کو پراگندہ کیا جا رہا ہوتا ہے اور ساری شخصیت اسی گندگی کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دیکھی جانے والی چیز سے زیادہ اثر انگیز پڑھی جانے والی چیز ہوتی ہے۔ یوں خیالات‘ تصورات اور گفتگو میں ایسی ہی شیطانیت کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو کہ ان کتابوں کا مقصد ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کو مفید کتابوں کی طرف مائل کرنا والدین کا کام ہے۔

☆ **اچھی صحبت:** اچھے دوستوں کا انتخاب کرنا اور ان کی صحبت اختیار کرنا اپنے آپ کو درست رکھنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ دوستوں کا اثر انسان کی شخصیت پر ضرور پڑتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں دوستوں کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں بھی ہدایات ہیں کہ ((اَلرَّجُلُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِہٖ)) (رواہ الترمذی وابوداوٗد) ’’انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے‘‘۔ اچھی صحبت کی اجتماعیت ہی وہ بنیاد ہے جس کو اختیار کرنے کی دین اسلام نے تاکید کی ہے۔ بچوں کو اچھے دوست بنانے کی ترغیب دیں۔ ان کے سامنے اچھے دوست کون سے ہوتے ہیں‘ ان کا کردار کیسا ہونا چاہیے اور وہ کیا کرتے ہیں‘ کی تفصیل بتائیں تاکہ وہ اپنی پسند کو اسلامی معیار کے مطابق بنائیں اور جو دوست بن چکے ہیں ان کا جائزہ بھی لیں۔ والدین اس ضمن میں بچوں کے دوستوں سے میل ملاقات، ان کے گھروں میں آنا جانا ضرور رکھیں تاکہ دوستوں کے گھر کے ماحول اور ان کی عادت و خصلت سے واقفیت رہے۔ دوستوں کو اپنے گھر میں بھی جمع ہونے کا موقع دیں اور ان سے دوستانہ رویہ اپنائیں تاکہ دوستوں کی اخلاقی حالت بھی درست رہے اور آپ کے بچے کا بھی بھلا ہو۔ بہتر یہ ہے کہ بچوں کو کسی ایسی اجتماعیت سے منسلک کیا جائے جو کہ ابتدا ہی سے صحت مندانہ سرگرمیوں کے ذریعے بچوں کے اخلاق و کردار کو بھی سنوارنے کا کام کرتی ہو۔ فارغ اوقات کو اپنی قیمتی متاع جانتے ہوئے اگر والدین خود بھی اور اپنے بچوں کو بھی اس کا مفید استعمال سکھائیں تو اُمتِ مُسلمہ کا یہ گراں قدر سرمایہ باطل کے رنگ میں رنگنے سے بچ جائے گا۔

☆ **مفید مشغلے اور دل چسپ سرگرمیاں:** کہتے ہیں کہ فارغ دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ جب کرنے کو کوئی مفید کام نہ ہو تو انسان اپنی توانائیاں بے کار کاموں میں صرف کر کے اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرتا ہے۔ بچوں کو فارغ اوقات میں دل چسپ اور مفید سرگرمیوں کی طرف مائل کریں اور سہولیات فراہم کریں۔ باغبانی‘ کہانی لکھنا‘ مختلف مقامات کی تصاویر جمع کر کے البم تیار کرنا، اہم تاریخوں کے اخبارات کا ریکارڈ جمع کرنا‘ کسی خاص موضوع پر تحریریں جمع کرنا‘ پینٹنگ کرنا‘ ٹکٹ جمع کرنا‘ بیت بازی کا مقابلہ کرنا‘ تقریریں کرنا‘ بچوں کا مشاعرہ منعقد کرنا‘ احادیث اور آیات سنانا‘ کہانی سنانے کا مقابلہ کروانا‘ صاف ستھرے لطیفے سنانا مفید مشغلے ہیں۔ لڑکیوں کو مختلف ہنر جس میں سلائی کڑھائی‘ بنائی وغیرہ سکھانا تاکہ وہ ان کی اگلی زندگی میں بھی کام آئے۔ غرض یہ کہ بچوں کو بہت سی ایسی سرگرمیوں کے ذریعے وقت کا استعمال سکھایا جا سکتا ہے کہ جس سے وہ ٹی وی‘ کارٹون اور فلموں سے دور رہیں۔ اس طرح بچوں کی ذہنی نشوونما بھی ہوتی ہے اور ان کا ذوق بھی نکھرتا ہے۔ جسمانی سرگرمیوں کا انتخاب بھی اسی لحاظ

سے موسم، جگہ اور جنس کو دیکھتے ہوئے کیا جا سکتا ہے۔ لڑکوں کو خاص طور پر کراٹے، تیراکی، گھڑسواری کے مواقع ضرور دیے جائیں۔

☆ **بچوں سے حقیقی تعلق**: مندرجہ بالا امور ایسے ہیں کہ اگر وہ اختیار کر لیے جائیں تو بھی اگر والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ ربط دوستانہ نہیں ہے تو یہ ساری کوششیں رائیگاں چلی جائیں گی۔ والدین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تربیت کے سارے کام کوئی دوسرا سرانجام دے اور وہ بالکل فارغ ہو جائیں۔ ایسے میں اگر بچہ اللہ کی رحمت سے نیک و صالح ہو گیا تو اس کا تمغہ بھی والدین کے سینے پر ہی سج جاتا ہے، اور بدقسمتی سے معاملہ اس کے برعکس ہو گیا تو روتے رہتے ہیں کہ ہم نے تو بڑی کوششیں کی تھیں، لیکن ہائے ہماری قسمت!

اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کے ساتھ دوستی کی جائے، ان کو اپنا صدقہ جاریہ سمجھا جائے اور ان کے لیے اپنے اوقاتِ کار کو ترتیب دیا جائے، جس میں والدین اور بچوں کا آپس میں تعلق بنے، نہ کہ سارا رشتہ تعلقات کی بنیاد پر چلتا رہے۔ اردگرد نظر دوڑائی جائے تو والدین اور بچوں کے درمیان صرف تعلقات کا رشتہ ہوتا ہے جس میں کوئی رمق تعلق کی نہیں ہوتی۔ بچپن میں والدین اپنی ذمہ داری یہی سمجھتے ہیں کہ اچھا کھانا، بہترین لباس، اور تعلیمی سہولیات مہیا کر کے ان کی ذمہ داریاں پوری ہو گئی ہیں، اور بڑھاپے میں یہی فصل اپنے بچوں کے ہاتھوں کاٹ کر کھاتے ہیں جس میں بچوں کو بھی یہی تربیت ہوتی ہے کہ والدین کی خدمت اسی مادی حد تک محدود ہے۔ اپنے بچوں کی دل کی باتوں کو سننے کی عادت ڈالیں۔ ان کے روزمرہ کے کاموں کو ان کی زبانی سنیں، جس میں ان کے اسکول، کالج کا احوال، ان کے دوستوں کی روداد، ان کی احمقانہ حرکتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ غلط اور ناپسندیدہ باتوں پر فوری طور پر ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے مناسب وقت میں اس کی اصلاح کی جائے۔ یہ وہ عوامل ہیں جن سے والدین اور بچوں میں دوستی کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ عمر کے نازک دور میں بچے اپنے والدین سے چھپ چھپ کر جو سرگرمیاں اختیار کرتے ہیں، اس کی آدھی سے زیادہ وجہ والدین کی اپنے بچوں سے ذہنی لحاظ سے دوری ہوتی ہے۔ بے جا سختی، ہر وقت لعن طعن، حد سے بڑھا ہوا پیار و محبت بچوں کو بگاڑنے کا سبب بنتا ہے۔ تعلق ہی رشتے کو قائم بھی رکھتا ہے اور مضبوط بھی، لہٰذا اپنے بچوں سے تعلق قائم کیجیے، کیوں کہ بچے آپ کی آخرت میں نجات کا باعث بھی ہیں اور اُمت کا سرمایہ بھی۔ (تشکّر: ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن لاہور)

* * *

امن وسلامتی کا پیام بَر کلمہ

عتیق الرحمٰن صدیقی

ایمانِ کامل کا اقتضا

ایمانِ کامل اس امر کا مقتضی ہے کہ اہلِ ایمان باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔ نہ تو ایک دوسرے سے بغض و عناد رکھیں اور نہ ہی نقصان اور اذیت پہنچانے کے روادار ہوں۔ ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کے محافظ ہوں۔ مصیبتوں' آفتوں اور ناگہانی آزمائشوں میں ایک دوسرے کا سہارا بنیں اور ہر دکھ درد میں شریک ہوں۔ بھلائی' حسن سلوک اور خاطر داری کا مظاہرہ کرنے میں پیش پیش ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے امن' شانتی اور سلامتی کے پیام بَر ہوں۔ حضرت ابوہریرہ ؓ نبی مکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

((لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا، اَوَلَا اَدُلُّكُمْ عَلٰى شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ، اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَكُمْ)) (۱)

''تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک کامل مؤمن نہ بن جاؤ' اور تم کامل مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہیں وہ کام نہ بتاؤں کہ جب تم اسے کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو (وہ یہ ہے کہ) تم آپس میں سلام پھیلاؤ۔''

نُصح و خیر خواہی کی ہدایت

اگر مسلم معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کو رحمت اور امن کی دعا دیں' ان میں باہم رشتہ محبت اور موانست کا ہو' ہر مسلمان دوسرے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو گویا ایسا معاشرہ جنت کی نظیر پیش کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۲)

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

آپ ﷺ نے باہم ایک دوسرے کی خیر خواہی پر زور دیا۔ حضرت جریر بن عبداللہ ؓ فرماتے ہیں:

بَایَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى اِقَامِ الصَّلَاةِ وَاِیْتَاءِ الزَّكَاةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ (۳)

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی نماز قائم کرنے' زکوٰۃ دینے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر۔''

خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ آپ دوسروں کے لیے بھلائی اور اچھائی کے طلب گار ہوں' شر سے آپ کو نفرت ہو' خود بھی اس سے محفوظ رہیں اور دوسروں کو بھی شر سے بچانے کے لیے فکرمند رہیں۔ جب ایک دوسرے سے ملیں تو آپ کا چہرہ مسرت اور خوشی سے تمتما رہا ہو' آپ کے چہرے پر مسکراہٹ ہو۔ یہ تبسم اور مسکراہٹ بھی صدقہ کی مانند ہے۔

معنی خیز اور حلاوت سے پُر کلمہ

اسلام جس کلمۂ خیر کی ہدایت کرتا ہے وہ کس قدر معنی خیز اور حلاوت سے پُر ہے' دلی جذبوں کا عکاس ہے' گویا محبت کا زم زم بہہ رہا ہے۔ یہ خوبصورت کلمہ ''السلام علیکم'' کی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ تمام قومیں محبت کے اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی کلمہ استعمال کرتی ہیں۔ عرب کے باشندے اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَیْنًا اور اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ صَبَاحًا کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ یعنی اللہ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرے' اللہ تمہاری صبح خوشگوار کرے۔ ایرانی بوقت ملاقات ''ہزار سال بزی'' یعنی ہزار برس جیو کا فقرہ کہتے تھے۔ یورپ میں گڈ مارننگ' گڈ ایوننگ اور گڈ نائٹ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر اسلام نے ان سب کے مقابلے میں نہایت جامع لفظ ادا کرنے کی ترغیب دی جس میں معنی کا ایک جہاں پنہاں ہے' گویا کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔

انبیاء کا پسندیدہ لفظ: سلام

انبیاء کرام ؑ نے بھی اسی لفظ کو پسند کیا۔ ﴿وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ﴾ (مریم:۳۳) اور ﴿وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۸۱﴾﴾ (الصّٰفّٰت) کے الفاظ اس پسندیدگی کے مظہر ہیں۔ اس لفظ میں تحدید اور تعیین نہیں بلکہ دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز پنہاں ہے۔ اس میں ایسی سلامتی کی طلب اور پکار ہے جو خالق دو جہاں اپنے بندوں پر نازل کرتا ہے۔ اس میں نہ تو مبالغہ آمیز تعظیم

ہے اور نہ بندگی اور کورنش کا کوئی غیر مشروع انداز۔ ایک شخص نے نبی محترم ﷺ سے استفسار کیا کہ جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو کیا اس کے لیے جھک جائے؟ فرمایا: ’’نہیں‘‘۔ اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے؟ فرمایا: ’’نہیں‘‘۔ اس نے کہا اس کا ہاتھ پکڑے اور اس سے مصافحہ کرے۔ فرمایا: ’’ہاں‘‘(٤)۔ دو مسلمان جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔ ماضی کی طرح متوحش نہیں ہوتے اور چوکنے ہو کر ایک دوسرے سے گریز نہیں کرتے۔ یہ دراصل پہچان کی ایک علامت ہے کہ دونوں اللہ و رسول پر ایمان رکھنے والے ہیں اور ایک ہی ملت سے وابستہ ہیں۔

سلام کا مفہوم

ابن عربی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے اور ’السّلام علیکم‘ کے معنی یہ ہیں کہ: ’’اللّٰہ رقیبٌ علیکم‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے‘‘۔ انہوں نے امام ابن عیینہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ’’اتدری بالسّلام؟ یقول انت آمن منی‘‘ یعنی تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون ہو(٥)۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿٨٦﴾﴾ (النساء) ’’اور (مسلمانو) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو‘ یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا حساب رکھنے والا ہے‘‘۔ تحیّہ کے لغوی معنی کسی کو ’’حیّاكَ اللّٰہُ‘‘ (اللہ تمہیں زندہ رکھے) کہنا ہے — قبل از اسلام عربوں کی عادت بھی ایسے الفاظ استعمال کرنے کی تھی۔ اسلام نے طرزِ تحیہ کو بدل دیا اور ’’السلام علیکم‘‘ کہنے کا طریقہ جاری کیا جس کے معنی ہیں ’’تم ہر تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو‘‘۔ ان الفاظ میں بندۂ مؤمن اعلان کرتا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے مامون و مصئون رہو گے‘ تمہاری جان و مال اور آبرو کی پوری پوری نگہداشت ہو گی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (٦)

’’مسلمان تو وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے سب مسلمان محفوظ رہیں (کسی کو تکلیف نہ پہنچے)۔‘‘

اسلامی تحیہ میں اللہ کا ذکر بھی ہے‘ تذکیر بھی ہے‘ ربط و تعلق اور محبت کا اظہار بھی ہے‘ دعا بھی ہے اور حفاظت کرنے کا ایک معاہدہ بھی ہے۔

سلام کو پھیلانے کی ترغیب

رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو سب سے پہلے اپنے پیروکاروں کو جو تعلیم دی‘ وہ یہ تھی:

((اَيُّهَا النَّاسُ اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصَلُّوْا وَالنَّاسُ نِيَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ)) (٧)

’’لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ‘ کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو‘ (یہ سب کرو گے) تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔‘‘

سلام کرنے کے لیے شناسا اور ناآشنا کی تخصیص نہیں‘ مرد اور عورت کی تفریق نہیں اور نہ بڑے اور بچے میں کوئی امتیاز ہے۔ البتہ دو اصول پیش نظر رکھے جائیں: ایک یہ کہ چھوٹا بڑے کو‘ گزرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے اور اسی طرح سوار کو چاہیے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔ گویا اس اصول میں یہ سبق مضمر ہے کہ تواضع اور خاکساری کا اظہار کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اہل و عیال کو بھی گھر جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا۔ مجلس سے اُٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے۔

تحیہ کی آیت میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دو یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہہ دو۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ‘ آپؐ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا: ((وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ)) پھر ایک صاحب آئے اور انہوں نے سلام میں یہ لفظ کہے: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَرَحْمَتُهٗ آپؐ نے جواب میں ایک اور کلمہ بڑھا کر فرمایا: ((وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ))۔ پھر ایک صاحب آئے‘ انہوں نے اپنے سلام میں تینوں کلمے بڑھا کر کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ آپؐ نے جواب میں صرف ایک کلمہ فرمایا: ((وَعَلَيْكَ))۔ ان کے دل میں شکایت پیدا ہوئی اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان‘ پہلے جو حضرات آئے آپؐ نے ان کے جواب میں

کئی کلمات دعا کے ارشاد فرمائے اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپؐ نے وَعَلَيْكَ پر اکتفا فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے ہمارے لیے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے۔ تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیے ہیں‘ اس لیے ہم نے قرآنی تعلیمات کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفا کر لیا۔(۸)

سلام میں الفاظ بڑھانے کی اہمیت

سلام میں وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ کے الفاظ بڑھانے کو نبی اکرم ﷺ نے پسند فرمایا‘ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک شخص نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کو دس نیکیاں ملیں۔ دوسرے نے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ کہا تو آپؐ نے فرمایا کہ ”اس کو بیس نیکیاں ملیں“۔ تیسرا آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ کہا تو آپؐ نے فرمایا: ”اس کو تیس نیکیاں ملیں“۔(۹)

گویا سلام کا جواب بہتر طریقہ سے دینا اجر و ثواب کا باعث ہے‘ کم الفاظ میں جواب دینے کو فقہاء نے جائز تو رکھا ہے مگر آیۂ تحیہ کی رو سے یہ استحساناً ناکافی ہے۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے۔ اس میں حکمت یہ بھی ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مزید زیادتی سے احتراز فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ نے مذکورہ تین کلموں میں اضافہ کرنے والے کو یہ کہہ کر روک دیا: اِنَّ السَّلَامَ قَدِ انْتَهٰى اِلَى الْبَرَكَةِ یعنی سلام لفظ برکت پر ختم ہو جاتا ہے (بحوالہ تفسیر مظہری)۔

سلام میں تین کلمے کہنے والے کے جواب میں ایک کلمہ بھی کفایت کرتا ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے وَعَلَيْكَ پر اکتفا فرمایا۔ اس سے اَوْ رُدُّوْهَا کا منشا بھی پورا ہو جاتا ہے۔ آیت اِذَا حُيِّيْتُمْ کا اقتضا یہ بھی ہے کہ جب ایک مسلمان دوسرے کو سلام کرے تو وہ اس کا جواب ضرور دے۔ یہ اس پر واجب ہے‘ اگر جواب نہ دیا تو وہ گناہ گار ہوگا۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ مقرّب وہ شخص ہے جو سلام کی ابتدا کرے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ سنت مؤکّدہ ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں: السَّلام تطوع والرَّد فريضة یعنی ابتداءً سلام کرنے میں تو اختیار ہے لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے۔ سلام کا جواب دینا لازمی تو ہے مگر اس میں استثناء بھی ہے۔ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے اور کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا مفسدِ نماز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص خطبہ دے رہا ہے‘ تلاوتِ قرآن میں مصروف ہے یا اذان و اقامت کہہ رہا ہے‘ حوائج ضروریہ میں سے کسی حاجت کی تکمیل کر رہا ہے تو اسے سلام کرنا جائز نہیں اور جواب دینا بھی واجب نہیں۔

مصافحہ‘ معانقہ اور استقبال کا انداز

اظہارِ محبت کا ایک ذریعہ مصافحہ بھی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے۔ ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی ممانعت بھی آئی ہے مگر یہ بعض حالات سے مختص ہے۔ اگر کوئی شرعی عذر نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے۔ حضرت زید بن حارثہ ؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے انہیں گلے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا۔(۱۰) کسی محبوب شخصیت کے استقبال میں کھڑے ہو جانے میں بھی مضائقہ نہیں۔ حضرت فاطمہ ؓ جب رسول کریم ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپؐ کھڑے ہو جاتے‘ ان کا ہاتھ چومتے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے۔ البتہ مشرکانہ قسم کے آداب سے آپؐ نے منع فرمایا۔ غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے امیروں اور بادشاہوں کے لیے کھڑے ہو جانے سے منع فرمایا اور کہا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے ایسے کھڑے نہ ہوا کرو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔(۱۱)

گھر میں داخل ہونے کے لیے صاحب خانہ سے اجازت

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینا ضروری ہے۔ اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں؟ تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے‘ البتہ دکانوں اور پبلک مقامات پر جانے کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ رسول کریم ﷺ کسی کے مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا‘ اس لیے اجازت لینے سے پہلے دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہوتے تھے‘ سامنے کھڑے نہیں ہوتے تھے تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے۔(۱۲)

قرآن حکیم نے ان اوقات کی بھی تعیین کر دی ہے جن میں بچوں کو اپنے والدین کے کمروں میں جانے کے لیے بھی اجازت لینا لازمی ہے۔ ایک تو نماز صبح سے پہلے‘ دوسرے دوپہر کو اور تیسرے نماز عشاء کے بعد۔ ان تینوں اوقات کو پردے کے اوقات قرار دیا گیا۔ سورۃ النور میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

اختتامیہ

ایک مؤمن دوسرے مؤمن کا آئینہ بھی ہے اور بھائی بھی، مگر یہ بھائی چارہ، اخوت اور محبت کا چلن اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب اہلِ ایمان ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت اور نگہداشت کریں، اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمہ وقت مستعد رہیں اور ان اوصاف سے اپنے آپ کو متصف اور مزین کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہیں جو اُسوۂ حسنہ کے صحیح عکاس ہوں۔ شفاعتِ حسنہ کی صورت بھی اسی اُسوہ کی ایک کرن اور اسی نور کا ایک پرتو ہے۔

حواشی

(١) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان انه لا یدخل الجنة الی المؤمنون......

(٢) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه مایحب لنفسه۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه۔

(٣) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب الدین النصیحة للّٰه ولرسوله ولائمة المسلمین وعامتهم۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ان الدین النصیحة۔

(٤) سنن الترمذی، کتاب الاستیذان، باب ما جاء فی المصافحه۔

(٥) بحواله معارف القرآن، جلد دوم، سورة النساء۔

(٦) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام وای اموره الفضل۔

(٧) سنن الترمذی، باب صفة القیامة والرقائق والورع، باب منه۔

(٨) بحواله معارف القرآن، جلد دوم۔

(٩) سنن ابی داوٗد، کتاب الادب، باب کیف الاسلام۔

(١٠) سنن الترمذی، کتاب الاستیذان، باب ما جاء فی المعانقة والقبلة۔

(١١) سنن ابی داوٗد، کتاب الادب، بحواله باب ما جاء فی القیام۔

(١٢) الادب المفرد، باب کیف یقوم عند الباب۔

* * *

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

آذان اور اِقامت

آغاز' فضائل اور احکام

حافظ محمد زاھد☆

اَذان کا لغوی معنی ہے ''اعلان کرنا''۔ شرعی اصطلاح میں ''چند مخصوص الفاظ کے ساتھ خاص ساعتوں میں اوقاتِ نماز شروع ہونے کی اطلاع دینا'' اذان کہلاتا ہے۔ یہ لفظ اَذان ہے' جبکہ بعض لوگ اسے آذان کہتے ہیں جو غلط ہے' اس لیے کہ آذان' اُذن کی جمع ہے جس کا معنی ہے ''کان''۔ اذان کا لفظ قرآن میں بھی مذکور ہے: ﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ﴾ (التوبہ:۲) ''اور صاف اعلان ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے'' —— اذان دینے والے کو ''مؤذن'' کہا جاتا ہے اور یہ لفظ بھی قرآن پاک میں موجود ہے: ﴿ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ﴾ (یوسف:۷۰) ''پھر اعلان کیا ایک اعلان کرنے والے نے۔''

احادیث کے ساتھ ساتھ قرآن پاک میں بھی ''نماز کے لیے اذان دینے'' کا ثبوت واضح طور پر موجود ہے۔ سورۃ الجمعہ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ⑨﴾

''اے ایمان والو! جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کی یاد کو اور چھوڑ دو خرید وفروخت۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے۔''

اذان کی عظمت کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا: ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مؤمن کی اذان سے پیدا!

☆ادارتی معاون' شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی' لاہور۔ 0321 4291904

اذان کا آغاز

رسول اللہ ﷺ کو نبوت ملنے کے بعد سب سے پہلے نماز کا حکم دیا گیا اور جبریل ؑ نے نبی کریم ﷺ کو وضو اور نماز کا طریقہ سکھایا۔ مکہ میں تو آپؐ بغیر اذان اور اقامت کے نماز ادا فرماتے تھے' لیکن جب آپؐ مدینہ ہجرت کر گئے اور وہاں مسجد نبوی کی تعمیر شروع کی تو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ جماعت کا وقت قریب ہونے کی عام اطلاع کے اعلان کے لیے کوئی خاص طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ صحابہ کرام ؓ نماز باجماعت کے انتظار میں وقت سے بہت پہلے آ کر مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور اس طرح ان کی معیشت اور باقی معاملات کو نقصان پہنچتا تھا۔ اس بارے میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے مشورہ کیا تو اس مشورہ میں پانچ چیزوں کے بارے میں رائے دی گئی:

① کسی بلند ٹیلے پر خاص جھنڈا بلند کیا جائے۔
② مجوسیوں کی طرح آگ جلائی جائے۔
③ یہودیوں کی طرح نرسنگھا بجایا جائے۔
④ عیسائیوں کی طرح ناقوس بجایا جائے۔
⑤ نماز کا اعلان کیا جائے۔

روایات کے مطابق نماز باجماعت کے لیے کسی آدمی کے ذریعے اعلان کرانے کی تجویز حضرت عمر ؓ نے دی تھی اور اذان کا طریقہ رائج ہونے سے پہلے کچھ عرصہ تک مدینہ میں اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ کی ندا رائج رہی۔ بعد میں یہ نداصلوٰۃ کسوف وغیرہ جیسے مواقع پر دی جاتی رہی۔

نبی کریم ﷺ اس معاملے میں کافی متفکر رہے اور چند صحابہ کرام ؓ بھی اس مسئلہ کے لیے بہت بے چین اور متفکر ہوئے۔ ان میں ایک صحابی حضرت عبداللہ بن زید ؓ بھی تھے۔ ایک رات خواب میں ان کو اذان و اقامت کے کلمات سکھائے گئے اور یہ خواب تیرہ یا بیس صحابہ کرام ؓ کو آیا۔ اس کے بعد نماز کی طرف بلانے کے لیے اذان ہمیشہ کے لیے مشروع ہو گئی۔ یہ اغلباً دو ہجری کا واقعہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن زید ؓ کا خواب

اذان والا خواب سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن زید ؓ نے نبی کریم ﷺ کو سنایا۔ ان کے بیٹے محمد بن عبداللہؒ روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد گرامی حضرت عبداللہ بن زید ؓ

نے بیان فرمایا:

> ''جب رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لیے جمع کرنے کی خاطر ناقوس بنانے کا حکم دیا تو میں نے خواب میں ایک شخص کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ناقوس تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: اے بندۂ خدا تو اسے بیچے گا؟ اس نے کہا: تو اس کا کیا کرے گا؟ میں نے کہا: ہم اس کے ذریعے لوگوں کو نماز کے لیے بلایا کریں گے۔ اس نے کہا: کیا میں تم کو وہ طریقہ نہ بتادوں جو اس سے بہتر ہے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ اس نے کہا کہو:
>
> **اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ**
>
> پھر وہ شخص پیچھے ہٹ گیا مگر دور نہیں گیا اور کہا جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو یہ کہہ:
>
> **اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ**
>
> پس جب صبح ہوئی تو میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو خواب میں نے دیکھا تھا بیان کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''بلاشبہ یہ خواب سچا ہے انشاء اللہ' تم بلالؓ کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور جو تم نے خواب میں دیکھا اور سنا ہے وہ بتاتے جاؤ' بلالؓ اذان دیں گے کیونکہ انکی آواز تم سے زیادہ بلند ہے''۔ پس میں بلالؓ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میں ان کو بتاتا جاتا تھا اور وہ اذان دیتے جاتے تھے۔ (حضرت عبداللہ بن زیدؓ) فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن خطاب ؓ نے یہ اذان سنی وہ اپنے گھر میں تھے۔ پس وہ جلدی سے اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے گھر سے باہر نکلے: یارسول اللہ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو سچا پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا ہے' میں نے بھی خواب میں ایسا ہی دیکھا ہے۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: ''شکر اللہ ہی کے لیے ہے۔''(۱)

حضرت عبداللہ بن زیدؓ اس خواب کو دیکھنے اور رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے سنانے اور پھر اس خواب کی وجہ سے اذان کے مشروع ہونے کو اپنے لیے بڑے فخر کا باعث سمجھتے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے چند اشعار میں کیا جن کا ترجمہ درج ذیل ہے:

> ''میں بزرگی اور احسان کرنے والے اللہ کی حمد و تعریف کرتا ہوں اور بہت تعریف اذان سکھانے پر۔ جب خوشخبری دینے والا فرشتہ اللہ کی جانب سے میرے پاس اذان لایا' میرے نزدیک کیسا عزت والا خوشخبری سنانے والا ہے۔ تین رات مسلسل میرے پاس آیا اور جب بھی آیا میرے عزت اور وقار میں اضافہ کر گیا۔''(۲)

حضرت بلال ؓ اسلام کے پہلے مؤذن

ماقبل بیان کردہ حدیث میں یہ صراحت موجود ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید ؓ نے جب اپنا خواب نبی کریم ﷺ کو سنایا تو آپؐ نے فرمایا کہ اذان کے یہ کلمات بلال کو بتاؤ تاکہ وہ اذان دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت بلال ؓ کو اسلام کے پہلے مؤذن ہونے کی فضیلت حاصل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا نام اس لیے تجویز کیا کہ حضرت بلالؓ نے مکہ کی تپتی ریت پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی بہت اعلیٰ شان سے بیان کی اور ظلم و ستم کے باوجود اَحَدْ اَحَدْ کی صدا بلند کرتے رہے۔

حضرت بلالؓ کو مؤذنِ اسلام کی حیثیت سے زیادہ شہرت اور عروج اس وقت حاصل ہوا جب انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر انتہائی جوش اور جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر اذان دی جس کی آواز مکہ کے پہاڑوں میں گونج اُٹھی۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی خلافت میں بھی حضرت بلالؓ مسجد نبویؐ کے مؤذن رہے۔ حضرت عمر ؓ کی خلافت میں آپؓ شام میں جہاد کی مہمات میں چلے گئے — بعض روایات کے مطابق آپؓ وصالِ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی مدینہ چھوڑ کر شام میں جہاد کے لیے چلے گئے اور پھر پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ اذان دی۔ ایک مرتبہ جب حضرت عمر فاروق دمشق کی ایک بستی جابیہ تشریف لائے تو ان کی فرمائش پر اذان دی اور دوسری مرتبہ مسجد نبوی میں۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے:

> ''ایک رات خواب میں حضرت بلالؓ کو رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے بلال! اس دوری کی کیا وجہ ہے؟ میری زیارت کو کیوں نہیں آتے''۔ اس پر آپؓ بہت غمگین ہوئے اور اسی وقت سوار ہو کر مدینہ کی طرف چل پڑے۔ مدینہ پہنچ کر سیدھا رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر گئے اور خوب روئے۔ پھر حضرات حسن و حسین ؓ کے پاس گئے' ان کو گلے لگایا اور ان کا بوسہ لیا۔ انہوںؓ نے آپؓ سے اذان دینے کی فرمائش کی۔ آپؓ مسجد کی چھت پر چڑھے اور جب آپؓ نے ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ

اَکْبَرُ‘‘ کہا تو مدینہ میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ پھر جن آپؐ نے ’’اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ‘‘ کہا تو یہ بھونچال اور زیادہ ہو گیا۔ پھر جب آپؐ نے ’’اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ‘‘ کہا تو عورتیں اپنے گھروں سے نکل آئیں اور اس دن سے زیادہ مرد و عورتیں کبھی نہیں روئے۔‘‘(۳)

حضرت ابومحذورہؓ مسجد الحرام کے مؤذّن

اذان کے اس باب میں جہاں حضرت عبداللہ بن زید اور حضرت بلالؓ کو خاص فضیلت حاصل ہے وہاں ایک اور صحابی حضرت ابومحذورہ ؓ کو بھی اذان کے حوالے سے خصوصی فضیلت حاصل ہے۔ ان کا واقعہ ان کی زبانی ملاحظہ کریں۔ وہ فرماتے ہیں:

’’میں کچھ ساتھیوں کے ساتھ نکلا۔ ہم راستے میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے مؤذن نے نماز کے لیے اذان دی۔ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہی ہم نے مؤذن کی آواز سنی۔ اس وقت ہم اذان سے دور تھے (یعنی مسلمان نہ ہوئے تھے) ہم استہزاءً چیخ چیخ کر اس کی نقل اتارنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہماری آواز سنی تو کچھ لوگوں کو ہماری طرف بھیجا۔ انہوں نے ہمیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے لا بیٹھایا۔ آپؐ نے فرمایا: ’’تم میں سے کس کی آواز میں نے سنی جو بلند تھی‘‘۔ تو سب ساتھیوں نے میری طرف اشارہ کیا اور سچ ہی کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے سب کو چھوڑ دیا اور مجھے روک لیا اور مجھ سے فرمایا: ’’کھڑے ہو کر اذان دو‘‘۔ میں کھڑا ہوا اور میری یہ حالت تھی کہ رسول اللہ ﷺ اور اس اذان سے زیادہ جس کا مجھے آپؐ نے حکم دیا‘ کوئی چیز ناپسندیدہ نہ تھی۔ پھر بھی میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا تو آپؐ نے بذاتِ خود مجھے اذان کہلوائی...... پھر جب میں نے اذان مکمل کر لی تو مجھے بلا کر ایک تھیلی دی جس میں کچھ چاندی تھی‘ پھر میری پیشانی پر اپنا دست مبارک رکھا اور میرے چہرے‘ سینے و کلیجے پر ہاتھ پھیرا یہاں تک کہ آپؐ کا ہاتھ میری ناف کے قریب تک پہنچا پھر آپؐ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے اور تمہارے اوپر برکت دے‘‘۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپؐ مجھے مکہ میں اذان پر مامور فرما دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’میں نے تمہیں مامور کیا‘‘۔ اسی وقت رسول اللہ ﷺ کی نفرت میرے دل سے نکل گئی اور وہ سب نفرت رسول اللہ ﷺ کی محبت میں بدل گئی۔‘‘(۴)

حضرت ابومحذورہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ اس کے بعد آپؓ نے اپنے پیشانی کے بال اس لیے نہیں کٹوائے کہ ان پر رسول اللہ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک پھیرا تھا۔

سنن النسائی کی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے جب حضرت ابومحذورہ ؓ کو بیت الحرام میں اذان کے لیے مامور فرمایا تو انہیں اذان کے کلمات سکھائے اور فجر کی اذان میں ’’اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ‘‘ کے الفاظ کہنے کی ہدایت فرمائی۔(۵)

اذان کی شرعی حیثیت

اذان اسلام کا شعار ہے اور اس کی شرعی حیثیت سنّت مؤکدہ کی ہے یعنی پانچ فرض نمازوں اور جمعہ کے لیے اذان دینا سنت مؤکدہ ہے۔ بعض علماء نے اس کو واجب قرار دیا ہے۔ بہرحال سنت مؤکدہ اور واجب قریب قریب ہیں کہ ان کے ترک کرنے والا گناہ گار ہے اور اگر کسی شہر یا قصبہ والے مل کر یہ فیصلہ کر لیں کہ اس شہر یا قصبہ میں اذان نہیں دی جائے گی تو حاکمِ وقت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان سے جنگ کرے اور اس علاقہ میں اذان شروع کرائے۔

اذان کے کلمات کی تعداد

اذان کے ۱۵ کلمات ہیں‘ جن کا ذکر حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی بیان کردہ روایت میں آیا ہے‘ اور فجر کی اذان کے سترہ کلمات ہیں‘ بایں معنی کہ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کے بعد دو مرتبہ اَلصَّلَاۃُ خَیْرٌ مِنَ النَّوْمِ ہے۔ اس کی وجہ احادیث میں یہ مذکور ہے کہ ایک دن حضرت بلالؓ اذانِ فجر کے بعد نبی کریم ﷺ کو نماز کی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوئے اور معلوم ہوا کہ آپؐ سو رہے ہیں تو حضرت بلالؓ نے یہ کلمات فرمائے کہ نماز نیند سے بہتر ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’اس سے زیادہ اچھی بات کوئی نہیں کہ ان کلمات کو اذان فجر میں کہو‘‘۔ پھر اس دن سے یہ کلمات فجر کی اذان میں شامل ہو گئے۔

امام شافعیؒ اذان میں ترجیع کے قائل ہیں‘ یعنی شہادتین کو دو دفعہ آہستہ آواز سے اور دو دفعہ اونچی آواز سے ادا کرنا —— امام مالکؒ ترجیع بلا تربیع کے قائل ہیں‘ یعنی شروع میں اللہ اکبر صرف دو دفعہ اور ترجیع یعنی شہادتین کو چار چار دفعہ ادا کرنا۔ اس اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ تربیع بلا ترجیع کے قائل ہیں‘ یعنی شروع میں اللہ اکبر چار مرتبہ اور شہادتین دو دو مرتبہ۔

اقامت کے کلمات

اقامت کے کلمات ۱۷ ہیں‘ بایں معنی کہ ۱۵ کلمات اذان کے اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کے بعد دو دفعہ قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ۔ حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی حدیث میں اقامت کے کلمات

کی تعداد گیارہ آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے شوال ۸ ہجری کو حضرت ابو محذورہ ؓ کو اذان اور اقامت کے کلمات بنفس نفیس خود سکھائے اور یہ تعداد ۱۷ ہی ہے۔

نوٹ: اذان کے کلمات کی تعداد کی طرح اقامت کے کلمات کی تعداد کے بارے میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے۔ ماقبل بیان کردہ تعداد امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اقامت کے کلمات کی تعداد ۱۱ ہے۔ شروع میں اور آخر میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ دو دو دفعہ' قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ دو دفعہ اور باقی کلمات ایک ایک دفعہ—— امام مالکؒ کے نزدیک اقامت کے کلمات کی تعداد دس ہے۔ شروع میں اور آخر میں اَللّٰہُ اَکْبَرُ دو دو دفعہ اور باقی سارے کلمات قَدْ قَامَتِ الصَّلَاۃُ سمیت ایک ایک دفعہ۔

اذان کی حکمتیں اور فوائد

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ علماء نے اذان کی چار حکمتیں بیان کی ہیں:

① اذان میں شعائرِ اسلام اور کلمہ توحید کا اظہار ہوتا ہے۔
② لوگوں کو نماز کا وقت شروع ہونے کی اطلاع ملتی ہے۔
③ نماز پڑھنے کی جگہ کی نشاندہی ہوتی ہے' یعنی مسافر اور اجنبی شخص کو اذان کی آواز سے پتا چل جاتا ہے کہ فلاں جگہ مسجد ہے۔
④ نماز باجماعت کے لیے لوگوں کو اذان کے ذریعے دعوت دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اذان کے بے شمار فوائد ہیں' مثلاً اس میں اللہ کی کبریائی کا واشگاف الفاظ میں بیان ہے' اللہ کی توحید اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کی گواہی کا تذکرہ ہے اور اس میں نماز کے دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہونے کا اعلان ہے۔

اذان کی فضیلت

اذان اسلام کا شعار ہے اور یہ نماز کی طرف بلانے کا ذریعہ ہے۔ اذان خود بھی ایک عبادت ہے اور احادیث میں اس کی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''جب نماز کی اذان کہی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے اور مارے خوف کے وہ گوز مارتا اس حد تک بھاگتا چلا جاتا ہے کہ اذان کی آواز نہ سنے۔ جب اذان ختم ہو جاتی ہے تو واپس آ جاتا ہے اور جب نماز کی اقامت کہی جاتی ہے تو نمازی کے دل

> میں وسوسے ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ فلاں بات یاد کر' فلاں بات یاد کر۔ وہ (تمام) باتیں جو اس کو یاد نہ تھیں یاد دلاتا ہے' یہاں تک کہ آدمی بھول جاتا ہے کہ اس نے کس قدر نماز پڑھی ہے۔''(۶)

ایک روایت میں اذان کی فضیلت بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ لوگوں کو اذان دینے کی فضیلت معلوم ہو جائے تو وہ اس کے لیے لوگ قرعہ اندازی کرنے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ((لَوْ یَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِی النِّدَاءِ وَالصَّفِّ الْاَوَّلِ ثُمَّ لَمْ یَجِدُوْا اِلَّا اَنْ یَسْتَهِمُوْا عَلَیْهِ لَاسْتَهَمُوْا))(۷)

> ''اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اذان اور صف اول میں شامل ہونے کا کتنا ثواب ہے تو پھر (یہ چیز) قرعہ ڈالے بغیر حاصل نہ ہو تو لوگ ضرور قرعہ ڈالیں۔''

دنیا میں ہر وقت گونجنے والی آواز: اذان

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اوقات کا ایسا نظام رائج کیا ہے جس کی بدولت دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایسا کوئی سیکنڈ نہیں ہوتا جس میں دنیا میں کہیں اذان نہ ہو رہی ہو۔ یہ اذان کی ایسی فضیلت ہے جس کو غیر مسلم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ انٹرنیشنل رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر وقت گونجنے والی آواز اذان ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

> انڈونیشیا سے فجر کی اذان کا سلسلہ شروع ہو کر سماٹرا تک آ جاتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ ملاہا' ڈھاکا' سری لنکا اور پورے انڈیا کے بعد پاکستان میں شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد افغانستان' مسقط' سعودیہ' یمن' عراق میں اذان شروع ہو جاتی ہے۔ پھر اسکندریہ' استنبول' طرابلس' لیبیا' نارتھ امریکا میں اذانِ فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور ایسے فجر کی اذان نو (۹) گھنٹے کا طویل سفر طے کرتی ہے۔ پھر انڈونیشیا میں ظہر کی اذان کا وقت ہو جاتا ہے۔ پھر اسی ترتیب سے ظہر کی اذان دنیا کے کونے کونے میں گونجتی ہے۔ یوں پانچ وقت کی اذان سے چوبیس گھنٹے میں ایک بھی ایسا سیکنڈ نہیں ہے جب اذان کی آواز دنیا کے کسی کونے میں نہ گونج رہی ہو۔

اذان کی آواز کا ہر وقت گونجنا اللہ تعالیٰ کے اپنے پیارے رسول محمد ﷺ سے کیے ہوئے وعدے ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴﴾ (الم نشرح) ''ہم آپ کے ذکر کو بلند کریں گے'' کی ایک جھلک ہے۔ سبحان اللہ!

لندن کے رپلے (Ripley) نامی شخص نے اپنی کتاب ''مانو یا نہ مانو'' اس سوال کے جواب میں لکھی ہے کہ دنیا میں کون سی آواز سب سے زیادہ سنی جاتی ہے؟ اس کے لیے اس نے کرۂ ارض کا دورہ کیا اور بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایک ہی آواز ایسی ہے جو دنیا میں ہر وقت یکسانیت کے ساتھ بلند ہوتی رہتی ہے اور وہ آواز ہے اللہ اکبر اللہ اکبر یعنی اذان۔ اس کے ثبوت کے طور پر اس نے مصر، فلسطین، عرب، ہندوستان، انڈونیشیا، افریقہ، افغانستان، شام، عراق اور قسطنطنیہ کی مساجد کے اعداد و شمار گنوائے ہیں جن کے میناروں سے ہر وقت اذان کی آواز گونجتی ہے۔

مؤذّن کی فضیلت

اذان افضل عمل ہے، جیسا کہ ماقبل بیان کردہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے، تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ افضل عمل کو کرنے والا بھی افضل ہوتا ہے۔ سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیت ۳۳: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ یہ آیت مؤذن کے بارے میں ہے۔ اس میں مؤذن کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

> ''اور کس کی بات زیادہ اچھی ہو سکتی ہے اس شخص (کی بات) سے جو اللہ کی طرف بلائے!''

احادیث نبویہ میں بھی اذان دینے والے کی فضیلت مذکور ہے:

① حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فَاِنَّهٗ لَا يَسْمَعُ مَدٰى صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَّلَا اِنْسٌ وَّلَا شَیْءٌ اِلَّا شَهِدَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۸)

> ''مؤذن کی آواز جن و انس اور جو بھی سنتے ہیں وہ روزِ قیامت اس (اذان دینے والے کے حق میں) گواہی دیں گے۔''

② حضرت معاویہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

((اَلْمُؤَذِّنُوْنَ اَطْوَلُ النَّاسِ اَعْنَاقًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۹)

> ''اذان کہنے والے قیامت کے دن دوسرے لوگوں کے مقابلے میں لمبی گردن (زیادہ عزت) والے ہوں گے۔''

③ حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''اذان دینے والے اور تلبیہ پڑھنے والے اپنی قبروں سے اس حال میں نکلیں گے کہ مؤذن اذان دے رہا ہو گا اور تلبیہ پڑھنے والا تلبیہ پڑھ رہا ہو گا۔''(۱۰)

مولانا محمد منظور نعمانی اذان اور مؤذن کے فضائل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''اذان اور مؤذنوں کی جو غیر معمولی فضیلتیں ان حدیثوں میں بیان فرمائی گئی ہیں ان کا راز یہی ہے کہ اذان ایمان و اسلام کا شعار اور اپنے معنی و ترتیب کے لحاظ سے دین کی نہایت بلیغ اور جامع دعوت و پکار ہے اور مؤذن اس کا داعی اور گویا اللہ تعالیٰ کا نقیب اور منادی ہے۔ افسوس آج ہم مسلمانوں نے اس حقیقت کو بالکل بھلا دیا ہے اور اذان کہنا ایک حقیر پیشہ بن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس عظیم ترین اجتماعی گناہ کو معاف فرمائے اور توبہ و اصلاح کی ہمیں توفیق دے۔''(۱۱)

اذان و اقامت کا جواب: باعث فضیلت

اذان سننے پر بندہ کو دو قسم کے جوابات دینا ہوتے ہیں: ① عملی جواب یعنی نماز کے لیے مسجد روانہ ہونا، یہ واجب ہے ② قولی جواب یعنی اذان کے کلمات کا دہرانا، یہ سنت ہے اور بہت فضیلت کا باعث ہے۔ اذان کا جواب دینے پر بھی اتنا ہی ثواب ہے جتنا کہ اذان دینے پر ہے۔

حضرت ابوسعید خدری ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا سَمِعْتُمُ النِّدَاءَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ الْمُؤَذِّنُ))(۱۲)

> ''جب تم اذان سنو تو اس طرح کہو جس طرح مؤذن کہہ رہا ہو۔''

اذان کے جواب میں وہی الفاظ کہنے چاہئیں جو مؤذن کہہ رہا ہو، البتہ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ اور حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے جواب میں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہنا چاہیے۔

نوٹ: فقہاء کے نزدیک جمعہ کی دوسری اذان کا جواب زبان سے دینا مکروہ ہے، البتہ بغیر آواز کے دل میں جواب دینا چاہیے۔

اقامت کا جواب دینا بھی مستحب اور فضیلت کا باعث ہے، لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ اقامت کا جواب آہستہ آواز سے یا دل میں دیا جائے۔

اذان کا جواب نہ دینے کی چند صورتیں

اذان کا جواب دینا فضیلت کا باعث ہے، لیکن بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں اذان کا جواب دینا جائز نہیں ہے: ① نماز کے دوران ② خطبہ سننے کے دوران ③ بیوی سے ازدواجی

تعلق کے دوران ④ قضائے حاجت کے دوران۔

اذان کے بعد کے مسنون اعمال

اذان کے بعد تین چیزیں پڑھنی مسنون ہیں اور ان کی فضیلت بھی احادیث میں مذکور ہے۔

① **درود شریف:** حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

> ”جب تم مؤذن سے اذان سنو تو جیسے وہ کہتا ہے تم بھی کہو‘ پھر مجھ پر درود بھیجو۔ جو مجھ پر درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس رحمتیں نازل کرتا ہے۔ پھر اللہ سے میرے لیے وسیلہ مانگو کیونکہ وہ جنت کا ایک درجہ ہے اور اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ میں ہی ہوں گا۔ جو اللہ سے میرے لیے وسیلہ کی دعا کرے گا اس کے لیے میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔“(۱۳)

② **دعائے وسیلہ:** حضرت جابر بن عبداللہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص اذان سنتے وقت یہ دعا (اس دعا کو دعائے وسیلہ کہتے ہیں) پڑھے:

اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّامَۃِ وَالصَّلَاۃِ الْقَائِمَۃِ آتِ مُحَمَّدًا الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا الَّذِیْ وَعَدْتَہٗ

(ترجمہ: اے اللہ! اس مکمل دعوت اور قائم ہونے والی نماز کے پروردگار! محمد ﷺ کو وسیلہ اور خاص فضیلت عطا فرما اور انہیں مقام محمود پر کھڑا کر جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے) تو اس کو قیامت کے دن میری شفاعت نصیب ہوگی۔“(۱۴)

اس دعا میں **والدرجة الرفيعة** اور **وارزقنا شفاعته يوم القيامة** کا ذکر نہیں ہے۔ ملا علی قاری ؒ نے ”مرقات“ میں لکھا ہے کہ یہ دونوں جملے صوفیاء کے ہیں‘ اس لیے ان الفاظ کو مسنون دعا میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ اس دعا کے آخر میں **اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ** (یقیناً تو وعدہ خلافی نہیں کرتا) پڑھنا چاہیے‘ کیونکہ وہ دوسری احادیث سے ثابت ہے۔

اذان و اقامت کا درمیانی وقت دعا کی قبولیت کا وقت ہے‘ اس لیے ان اوقات میں دعائے وسیلہ کے ساتھ ساتھ مختلف دعائیں بھی کرنی چاہئیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((اَلدُّعَاءُ لَا یُرَدُّ بَیْنَ الْاَذَانِ وَالْاِقَامَۃِ))(۱۵)

”اذان و اقامت کے درمیان کی ہوئی دعا رد نہیں کی جاتی۔“

③ **کلمہ شہادت:** حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”مؤذن کی اذان سن کر جس نے یہ کہا:

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا

تو اس کے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے۔“(۱۶)

اذان اور اقامت کے متفرق احکام

① اذان دینے والا مسلمان‘ مرد اور صاحبِ عقل ہو۔

② اذان اور اقامت کے وقت مؤذِن قبلہ رخ ہو۔

③ اذان اور اقامت کہنے والے کا باوضو ہونا مستحب ہے‘ لیکن وضو کے بغیر بھی اذان ہو جاتی ہے البتہ مناسب نہیں ہے۔ اور اقامت بے وضو کہنا تو بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔

حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَا یُؤَذِّنُ اِلَّا مُتَوَضِّیٌٔ)) (۱۷)

”نہ اذان دے مگر باوضو آدمی۔“

④ فرض نماز کے لیے اذان اس نماز کے وقت شروع ہونے پر دی جائے‘ وقت سے پہلے اذان دینا درست نہیں۔

⑤ اذان اور اقامت عربی زبان میں خاص انہی الفاظ سے ہو جو نبی کریم ﷺ سے منقول ہیں۔

⑥ اذان کے دوران کانوں میں انگلیاں ڈالنا‘ حی علی الصلوٰۃ کے دوران دائیں طرف منہ پھیرنا اور حی علی الفلاح کے دوران بائیں طرف منہ پھیرنا بھی احادیث میں مذکور ہے۔

> ”حضرت عون بن ابی جحیفہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت بلال ؓ کو اذان دیتے ہوئے دیکھا‘ وہ اپنا منہ اِدھر اُدھر پھیرتے تھے اور ان کی دو انگلیاں ان کے دونوں کانوں میں تھیں۔“(۱۸)

امام ترمذی ؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس پر اہلِ علم کا عمل ہے کہ وہ مؤذن کے لیے اذان کے دوران انگلیوں کو کانوں میں ڈالنے کو مستحب کہتے ہیں۔ ایک روایت میں کانوں میں انگلیاں ڈالنے کی وجہ بھی مذکور ہے۔

’’رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال ؓ کو کانوں میں انگلیاں ڈالنے کا حکم دیا اور فرمایا: ’’اس کی وجہ سے تمہاری آواز بلند رہے گی۔‘‘(۱۹)

⑦ اذان اور اقامت کے دوران تھوڑا وقفہ کرنا ضروری ہے۔ حضرت جابر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال ؓ سے فرمایا:

> ’’اے بلال! جب تم اذان کہو تو ٹھہر ٹھہر کر اذان کہو اور جب اقامت کہو تو جلدی جلدی کہو، اور اذان اور اقامت میں اتنا ٹھہرو کہ کھانے والا کھانے سے، پینے والا پینے سے، قضائے حاجت کو جانے والا اپنی حاجت سے فارغ ہو جائے، اور تم لوگ نہ کھڑے ہوا کرو جب تک مجھے دیکھ نہ لو۔‘‘(۲۰)

⑧ جو اذان کہے وہی اقامت کہنے کا حق دار ہے، البتہ مؤذن کی اجازت یا اس کی غیر موجودگی میں کوئی اور اقامت کہہ سکتا ہے۔

⑨ فرض نمازوں کے علاوہ کسی اور نماز کے لیے اذان دینا سنت نہیں ہے، البتہ بعض مواقع ایسے ہیں جن میں اذان دینا مستحب ہے، مثلاً نومولود کے کان میں اذان کہنا وغیرہ۔

توجہ طلب

اذان اور اقامت کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں چند کوتاہیاں عام ہوتی جا رہی ہیں جن کی نشاندہی کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

① اذان کے دوران ٹی وی دیکھنا اور باتیں کرنا، حالانکہ اذان کو بغور سننے اور جواب دینے کا حکم ہے۔

② اذان کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا۔ ویسے تو ہر کام کی شروعات بسم اللہ سے کرنا برکت کا باعث ہے، لیکن اس کو اذان کا حصہ سمجھ کر پڑھنا ممنوع ہے۔ البتہ اگر مؤذن برکت کے لیے اذان کے شروع میں بسم اللہ دل میں بغیر آواز کے پڑھے تو یہ جائز ہے۔

③ اذان اور اقامت کے آخر میں کلمہ طیبہ کی طرح ’’مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ‘‘ پڑھنا، حالانکہ یہ اذان اور اقامت کا حصہ نہیں ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اسلام کے اس شعار کو نبی کریم ﷺ کی دعا کے مطابق ہمیشہ قائم رکھے اور ہمیں اس کا احترام کرنے، اس کا جواب دینے اور اس کے باقی احکامات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین یا رب العالمین!)

حواشی

(۱) سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، باب کیف الاذان۔

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب الاذان والسنۃ فیہ، باب بدء الاذان۔

(۳) *بحوالہ اسد الغابہ۔*

(۴) سنن ابن ماجہ، کتاب الاذان والسنۃ فیہ، باب الترجیع فی الاذان۔

(۵) سنن النسائی، کتاب الاذان، باب الاذان فی السفر۔

(۶) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب فضل التاذین۔ وصحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل الاذان وھرب الشیطان عند سماعہ۔

(۷) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الاستھام فی الاذان۔

(۸) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب رفع الصوت بالنداء۔

(۹) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل الاذان ……

(۱۰) معجم الاوسط للطبرانی، بحوالہ معارف الحدیث، ج۳، ص۱۰۸۔

(۱۱) معارف الحدیث، ج۳، ص۱۰۹۔

(۱۲) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب ما یقول اذا سمع المنادی۔

(۱۳) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعہ ……

(۱۴) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الدعاء عند النداء۔ وسنن الترمذی، ابواب الاذان، باب منہ آخر۔

(۱۵) سنن الترمذی، ابواب الاذان، باب ما جاء فی ان الدعاء لا یرد بین الاذان والاقامۃ۔ وسنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی الدعاء بین الاذان والاقامۃ۔

(۱۶) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن لمن سمعہ ……

(۱۷) سنن الترمذی، ابواب الاذان، باب ما جاء فی کراھیۃ الاذان بغیر وضوء۔

(۱۸) سنن الترمذی، ابواب الاذان، باب ما جاء فی ادخال الاصبع فی الأُذن عند الاذان۔

(۱۹) سنن ابن ماجہ، کتاب الاذان والسنۃ فیہ، باب السنۃ فی الاذان۔

(۲۰) سنن الترمذی، ابواب الاذان، باب ما جاء فی الترسّل فی الاذان۔

◆◆◆

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن
پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصّہ اول سُورۃ الفاتحہ و سُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات: 360، قیمت 450 روپے (پانچواں ایڈیشن)

حصّہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
صفحات 321، قیمت 400 روپے

حصّہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التّوبہ
صفحات 331، قیمت 400 روپے

❁ عمدہ طباعت ❁ دیدہ زیب ٹائٹل اور مضبوط جلد ❁ امپورٹڈ پیپر

ملنے کے پتے

انجمن خُدّام القرآن خیبر پختونخوا، پشاور
A-18 ناصر مینشن، ریلوے روڈ نمبر 2، شعبہ بازار پشاور، فون: 2584824,2214495(091)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

نئی
Easy Tear
پیکنگ میں

نزلہ، زکام، گلے کی خراش اور کھانسی!

Take NO Tension
Take Sualin
with TOOT SIYAH efficacy

ہمدرد